دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجہات قرآن حکیم کی جانب منعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبت جاگزیں ہو ـــــ اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کیلئے وقف کر دیں۔

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

ماہنامہ

میثاق لاہور

قواعد و ضوابط

- میثاق ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو موصول ہونی چاہیئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جا سکے گا۔
- ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ • پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہوگا۔
- کمیشن ۲۵ فی صد۔ محصول ڈاک : بذمہ میثاق
- قیمت : فی پرچہ ۷۵ پیسے • سالانہ زر مبادلہ : ساڑھے سات روپے

مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک : پندرہ روپے

نرخنامہ اشتہارات

ٹائیٹل کا آخری صفحہ ۸ × ۵ : ۱۲۵ روپے

ٹائیٹل کے اندرونی صفحات ۸ × ½۵ : ۱۰۰ روپے

(اس نئے سیٹ مبارک مقتبس کیجئے ورنہ تاآپ کی جباحت ہوگی)

اندرونی صفحات۔ فی صفحہ ۷۵ روپے۔ نصف صفحہ : ۵۰ روپے

ہندوستان کے خریدار

مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقم ارسال کرکے ہمیں مطلع فرما دیں،

۱۔ دفتر ماہنامہ "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ ـــ ۲۔ دائرہ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڑھ

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپکا زر مبادلہ ختم ہو چکا ہے۔ آئندہ کے لیے سالانہ زر مبادلہ مبلغ ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔ یا اگر کسی وجہ سے خریداری جاری نہ رکھنا چاہیں تو ہمیں مطلع فرما دیں ورنہ آئندہ شمارہ آپکو سالانہ زر مبادلہ اور محصول ڈاک کی مالیت کا وی پی ارسال ہوگا اور اس کو وصول کرنے کے آپ اخلاقاً ذمہ دار ہوں گے۔

اس شمارے میں

تذکرہ و تبصرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسرار احمد ۳

انوارِ ہدایت

★ شریعت و طریقت ۔۔۔ تلخیص و ترجمہ : پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۱۵

تدبرِ قرآن

★ تفسیر سورۂ مائدہ (۶) ۔۔۔۔۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۱۷

افاداتِ فراہیؒ

★ ہدایت و ضلالت ۔۔۔۔۔۔ ترجمہ : خالد مسعود ۴۱

مقالات

★ اصلاح معاشرہ (۳) ۔۔۔۔۔ مولانا عبد الغفار حسن ۴۷

★ صحیح نظامِ تعلیم اور پاکستان ۔۔۔۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۵۲

★ تاریخِ اسلامی میں صوفیائے کرام کا مقام ۔۔۔۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۶۲

خطوط و نکات

★ مقدر گو بر شاہ و اندیا بداند گوہری : مکتوب مولانا عبد الماجد دریا بادی ۷۳

★ مسلمانانِ ہند و پاک ۔ قرب و بُعد ،، عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی ۷۴

★ 'تدبرِ قرآن' قرآن کے ایک طالبعلم کی نگاہ میں ،، مولوی محمد عارف صاحب ۷۵

★ ہر بیڈ فرنگ ۔۔۔۔۔ ،، انصار احمد ایم اے (ریڈنگ، انگلینڈ) ۷۶

★ بلا تبصرہ و بلا عنوان ۔۔۔۔۔ ،، ایک 'کرم فرما' ۷۸

نظم

★ آخر کار ۔۔۔۔۔ مشکور حسین یاد، ایم اے ۶۹

اسرار احمد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

گذشتہ ماہ ڈاکٹر فضل الرحمان سابق ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تصنیف 'اسلام' کے خلاف جو شدید عوامی ردِ عمل ظاہر ہوا، اور اس کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو جس بے بسی کے ساتھ اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا، اسے بلا خوفِ تردید مذہبی، سیاسی اور انتظامی تمام ہی نقطہ ہائے نظر سے پاکستان کی تاریخ کے قریبی دور کا اہم ترین واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے ـــــ مذہبی اعتبار سے اس لئے کہ معاملہ بنیادی طور پر عوام کے مذہبی اعتقادات سے متعلق تھا اور سیاسی و انتظامی اعتبار سے اس لئے کہ اس نے فی الواقع ایک سیاسی ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس طرح فوری طور پر لاء اینڈ آرڈر اور نظم و نسق کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

عوام کے مذہبی جذبات کا جو فوری اور ہمہ گیر اظہار اس موقع پر ہوا واقعہ یہ ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی ایجی ٹیشن کے بعد کے پندرہ سالوں میں نہیں ملتی۔ عوام کے مذہبی احساسات کا یہ شدید ردِ عمل ایک اعتبار سے خوش آئند اور امید افزا بھی ہے اور ایک دوسرے نقطۂ نظر سے تشویش انگیز بھی۔ یہ بات بجائے خود تو بہت اچھی ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے مذہبی اعتقادات کے تحفظ کے لئے پوری طرح کمر بستہ ہوں اور اس معاملے میں کسی جانب سے بھی کوئی حملہ ہو تو وہ پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ سینہ سپر ہونے کو تیار رہیں۔ لیکن یہ امر کہ ان کا یہ مذہبی جذبہ کسی مسلسل اور پیہم سعی و جہد میں ڈھلنے کی بجائے صرف وقتی اور ہنگامی ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرتا ہے، جیسے کہ مذہب ان کے صرف جذبات سے متعلق ہو کر رہ گیا ہو، فی نفسہٖ تشویش انگیز اور مایوس کن ہے۔ اس لئے کہ یہ بہرحال ایک اٹل حقیقت ہے کہ مذہب کا دفاع صرف جذبات کی بنیاد پر وقتی اور ہنگامی تحریکیں اٹھانے سے نہیں ہو سکتا اس کے لئے محکم عقلی بنیادوں پر مسلسل اور پیہم جد و جہد ناگزیر ہے۔

یہ امر مزید افسوس ناک ہے کہ اس موقع پر بعض سیاسی عناصر نے بھی عوام کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی اور اپوزیشن کے بعض حلقوں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق اسے ایک سیاسی مسئلہ بنا

چاہا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر فضل الرحمان نے اپنے اس وضاحتی مضمون میں بھی کیا تھا جو لاہور کے ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا اور پھر اپنے استعفے میں بھی کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ طرزِ عمل نہایت خطرناک ہے اور اپنے اس خیال کو ہم خاص طور پر اس لئے بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت ان عناصر کو بزعم خویش جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ انہیں یہ خطرناک کھیل کھیلنے میں جری نہ کر دے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی متعدد بار ان صفحات میں واضح کیا ہے ——— اور اب پھر کسی قدر وضاحت کے ساتھ عرض کریں گے ——— پاکستان ہی نہیں، پورے عالم اسلام میں اس وقت مذہبی اعتبار سے متجددین اور قدامت پسند لوگوں کے دو طبقے فی الواقع موجود ہیں جن کے طرزِ فکر اور مجموعی مزاج میں بڑا بُعد ہے اور جو اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ ان کے مابین نزاع کسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ ہمہ گیر ہے اور اس نزاع کا حل سیاسی ہنگاموں سے نہیں بلکہ مسلسل افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے ہی سے ممکن ہے۔ ان اختلافات کے حل کا اصل پلیٹ فارم علمی مجالس ہیں نہ کہ عوامی جلسے اور جلوس۔ موخر الذکر طریقے سے معاملہ اگر سو بار سیدھا ہو سکتا ہے تو ایک بار بالکل الٹا بھی پڑ سکتا ہے اور اس کا نتیجہ کسی کے حق میں بھی مفید نہ ہو گا۔[1]

اس موقع پر مقامی و ضلعی سطح سے لے کر مرکزی حکومت تک ملک کی پوری انتظامی مشینری کا رویہ بہت قابلِ داد رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی جگہ سے بھی تشدد کی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ مقامی و ضلعی حکام نے نہایت دانشمندی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ اور ایک طرف عوام کو یہ اطمینان دلا کر وہ ان کے احساسات و جذبات کو حکومت تک پہنچا دیں گے ان کے جذبات کو مزید مشتعل ہونے سے روکا اور دوسری طرف فی الواقع حکومت کو صحیح صورتِ حال سے بروقت مطلع بھی کر دیا۔ نتیجۃً بروقت ایک صحیح اقدام ہو گیا اور صورتِ حال بگڑنے سے بچ گئی۔

اس صورتِ حال کا تقابل ۱۹۵۳ء سے کیا جائے تو ایک عجیب تضاد سامنے آتا ہے۔ اس وقت ملک میں وہ "پارلیمانی جمہوریت" قائم تھی جس کا از سرِ نو احیا جمہوریت کے ان علمبرداروں کا مقصدِ زندگی بن گیا ہے جو موجودہ حکومت کو "آمرانہ" قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس وقت کی جمہوری حکومت نے عوام کے مطالبات کا

---

[1] ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی موومنٹ اس کی ایک اہم مثال ہے۔ آنجہانی غلام احمد قادیانی کی امت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اگر ٹھنڈے استدلال اور دھیمی اور دھیمی چال کے ساتھ اور تسلسل و استقلال سے ہوتا تو یقیناً اس کے بہتر نتائج نکلتے۔ لیکن ایک جذباتی و ہنگامی تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر کے لئے تو خوب زور بندھا اور شور و ہنگامہ برپا ہوا لیکن اس کے بعد صورت یہ ہوئی کہ اب اس مسئلے پر بات کرنا بھی ممکن نہیں ——— پھر خاص اس مسئلے کے علاوہ اس تحریک سے جو نقصانات اس ملک کو سیاسی دونوں اور دینی و مذہبی ہر اعتبار سے پہنچے ان کا تذکرہ تحصیلِ حاصل ہے۔

جواب اینٹ، پتھر سے دیا تھا۔ اور اس وقت کی حکمران جماعت کے بعض عناصر نے اس خالص دینی و مذہبی مسئلے کو بھی اپنی جماعتی سیاست اور اس کے اندرونی جوڑ توڑ اور سازش و ریشہ دوانی کے سلسلے کی ایک کڑی بنانے میں کوئی شرم محسوس نہ کی تھی ——— نتیجۃً ایک عظیم سیاسی یورش برپا ہوئی تھی اور بے اندازہ خون خرابہ ہوا تھا۔ جس کے نتائج پاکستان کی سیاسی زندگی میں بہت دور رس ثابت ہوئے ——— اس کے بالکل برعکس رویہ موجودہ "آمرانہ" حکومت کا ہے کہ اس نے عوام کے جذبات کے آگے گھٹنے ٹیک دینے میں کوئی عار محسوس نہ کی اور ملک کو خون خرابے سے بچا لیا۔ اس مسئلے سے قطع نظر کہ اس کا اصل محرک عوامی جذبات و احساسات کا واقعی احترام ہے یا اپنے وقتی سیاسی مصالح، یہ امر بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ اگر اُس وقت کے حکمران بھی اسے اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیتے تو بالکل ۱۹۵۳ء کے سے حالات و واقعات رونما ہو کر رہتے اور ملک میں شدید افراتفری برپا ہوتی ——— ہم حکومتِ وقت کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اس نے ملک و ملت کے وسیع تر مفادات کے پیشِ نظر ایک وقتی سُبکی کو برداشت کر لیا۔

اس معاملے میں سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر فضل الرحمان کی ذات کو پہنچا ہے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان پر کسی قدر زیادتی بھی ہوئی ہے۔ نزاع تو دراصل دو مکاتبِ فکر اور دو نقطہ ہائے نظر کا تھا۔ یا پھر کسی درجے میں حکومت اور اپوزیشن کا۔ لیکن چونکہ اس وقت اتفاق سے ان کی ذات میں یہ دونوں حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں کہ وہ دین میں متجددانہ مکتبِ فکر کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے بھی سامنے آئے اور ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے بھی لہٰذا تنقید و ملامت کا اصل ہدف وہ بن گئے اور سب سے زیادہ مجروح ان کی شخصیت ہوئی۔ پھر جیسا کہ ایسے معاملات میں عموماً ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ بعض باتیں ان کی جانب غلط بھی منسوب کی گئیں اور ان کے بعض ایسے فقروں کا جو ایک سے زیادہ مفہوموں کے متحمل ہو سکتے تھے۔ ایک خاص متعین مفہوم بھی ان کے سر تھوپا گیا۔ اور ہنگامے کے شور و شغب میں ان کی تمام وضاحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ——— ہمارے ڈاکٹر صاحب سے نہ تو ذاتی مراسم ہیں اور نہ ان سے براہِ راست تبادلۂ خیالات کا موقع ہی کبھی کبھی ملا ہے۔ لیکن ایک دو مواقع پر انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی گفتگو سننے کا موقع ضرور حاصل ہوا ہے۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالبِ علم ہیں۔ ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف "نشوز" پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین و ایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ایک دینی پرچے میں ان کے بارے میں ایک بہت بڑے عالمِ دین کا یہ قول دیکھ کر ہمیں دکھ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تو بس وہی کچھ لکھتے ہیں جس کا اشارہ انہیں "اوپر" سے ملے (ان ھو الا وحی یوحیٰ!) ——— ہماری رائے میں "اسلام" ڈاکٹر صاحب کے اپنے آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس سے ان کی وسعتِ مطالعہ

اور دقتِ نظر کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے ——— یہ دوسری بات ہے کہ ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر ان کا نقطۂ نظر ایک خاص رخ پہ ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فکر و فلسفے اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تصنیف میں جہاں بہت مفید علمی مواد بھی موجود ہے اور بعض نکات بڑے دقیق اور نہایت وقیع ہیں وہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور 'اسلام' کا یہ پورا مطالعہ مغربی فکر و فلسفے کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہئیے کہ یہ معاملہ ایک ڈاکٹر فضل الرحمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی ایک بہت بڑی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے۔ اور ہماری قومی و ملی زندگی کے تمام فعال عناصر اس روگ کا شکار ہیں۔ ان میں جو جتنا ذہین اور جری ہے وہ اتنا ہی اپنے اصل نظریات و افکار کے ظاہر کرنے میں بے باک ہے۔ ورنہ اکثر و بیشتر کا اصل نقطۂ نظر فی الواقع یہی ہے اور عقلیت جدیدہ کے اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ سرسید مرحوم نے جس مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی تھی اس سے ہمارا سارا ہی تعلیم یافتہ طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وابستہ ہے۔ اور سائنس و ٹیکنالوجی سے مرعوبیت نے مغربی فکر و فلسفے کو پوری ملتِ اسلامیہ کے پڑھے لکھے طبقے کے قلوب و اذہان میں راسخ کر دیا ہے۔ یہ تو خدا بھلا کرے شیخین دیوبند رحمۃ اللہ علیہم کا کہ ان کی کوششوں کی بدولت قال اللہ و قال الرسولؐ کا ڈنکا کم از کم عوامی سطح پر بجتا رہا۔ اور عوام کے معتقدات و معمولات میں دین و مذہب کا ایک ڈھانچہ محفوظ رہ گیا ——— ورنہ واقعہ یہ ہے کہ 'عقلیت جدیدہ' کے اس سیلاب کے آگے کوئی بند تا حال نہیں باندھا جا سکا اور جس کسی نے بھی قال اللہ و قال الرسولؐ کے محفوظ گوشوں سے نکل کر اس سیلاب کی راہ میں آنے کی جرأت کی اُسے اکثر و بیشتر خود اپنی متاعِ ایمان سے ہاتھ دھو لینے پڑے ——— !

بنا بریں ——— ہمارے نزدیک اصل اہمیت شخص فضل الرحمان کی نہیں بلکہ اس مکتبِ فکر کی ہے جس کی مدلل و مبسوط نمائندگی انہوں نے کی ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی تصنیف 'اسلام' کی اشاعت کا ایک پہلو مفید بھی ہے ——— یعنی یہ کہ اس کے ذریعے دین میں تجدد کے علمبرداروں کا پورا مقدمہ اپنے بھرپور اور مکمل استدلال کے ساتھ یکجا سامنے آ گیا ہے۔ اس مکتبِ فکر کی نمائندگی اس سے پہلے صرف مسٹر غلام احمد پرویز کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات و تالیفات، اگرچہ ان کی تعداد بعض دوسرے بسیار نویس اہلِ قلم کے مانند درجنوں میں ہے، کسی محکم و مربوط فلسفے یا ٹھوس علمی و فکری مواد کی حامل نہیں ہیں بلکہ اکثر و بیشتر صرف خطابت، انشا پردازی اور جذبات نگاری کا مرقع ہیں ——— اس کے بالکل برعکس معاملہ 'اسلام' کا ہے۔ یہ بظاہر مختصر کتاب ایک متعین فکر پر مبنی ہے۔ اور اس نے اسلام کے اساسی اعتقادات سے لے کر نظامِ شریعت کی تفصیلی تشکیل تک پورے مسئلے کو ایک خاص نقطۂ نظر کے ساتھ مربوط شکل میں پیش کیا ہے اور اپنے طرزِ فکر کی تائید و تقویت کے لئے ایک ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ بھی

اسی نقطۂ نظر سے کر دکھایا ہے اور اس کی عقلی توجیہہ بھی پیش کر دی ہے۔ گویا کہ اب کی بار تجدد 'پائے چوبیں' کے ساتھ سامنے نہیں آیا ہے بلکہ 'آہنی ٹانگوں' کے ساتھ آیا ہے چاہے وہ اغیار سے ہی مستعار لی گئی ہوں لہٰذا عوام کے لئے تو یہ کافی ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔ لیکن اہلِ علم رجالِ دین کو اصل فکر اس علمی و فکری چیلنج کا جواب دینے کی کرنی چاہئیے۔ ہمارے نزدیک یہ وقت کا ایک بہت اہم مطالبہ ہے اور حقیقی عافیت اس سے آنکھیں چرانے میں نہیں بلکہ اس کا مواجہہ (FACE) کرنے میں ہے۔

اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کا نزاع تقریباً ابتدا ہی سے چلا آ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'مذہب' اپنی اصل کے اعتبار سے 'نقل' ہے جو اولاً فرشتے کی وساطت سے خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا اور پھر ان کی ذاتِ گرامی سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا اس کی اساس 'نقل' پر ہے نہ کہ 'عقل' پر ——— لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب انسان ہیں جو چاہے تمام کے تمام 'ذوی العقول' نہ ہوں، لیکن پیروی چونکہ وہ اپنی اسی اقلیت[1] کی کرتے ہیں جو 'ذی العقل' ہوتی ہے لہٰذا انسان پر حیثیت مجموعی حیوانِ عاقل کا اطلاق غلط نہیں ہے۔ بنا بریں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ بالکل ابتداء ہی سے مذہب کے 'نقل' کو 'عقل' پر پرکھنے اور اس کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوششیں ہوتی چلی آئی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ہر دور کی علمی و فکری سطح کے مطابق علم کلام کا ذخیرہ تیار ہوتا رہا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست صحبت کی بدولت جو ایمان حاصل ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے اور کسی غیر صحابی کے ایمان کو اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ انہیں علم الیقین ہی نہیں، حق الیقین کی جو کیفیت حاصل تھی اس میں استدلال کا عنصر اوّل تو تھا ہی کم۔ اور جتنا تھا اس کی اساس بھی فطرت کے نہایت محکم لیکن سادہ دلائل پر تھی نہ کہ فلسفیانہ و منطقیانہ قیل و قال پر۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دی گئی ہے کہ امت کے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کے ایمان کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے قلوب جس نورِ ایمان سے منور تھے اور ان کے سینے جس حرارتِ ایمانی سے معمور تھے اس کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کا "دلِ روشن" اور "نفسِ گرم" نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایمان نے ایک ایسے بے تابانہ جذبے اور والہانہ عشق کی صورت اختیار کر لی تھی جو ہر دم عمل کی بھٹیوں اور آزمائشوں اور ابتلاؤں کے الاؤں میں کودنے کو اس طرح آمادہ و تیار رہتا ہے کہ عقل بے چاری کے لئے "محوِ تماشائے لبِ بام" رہنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہتا[2]

---

[1] (INTELLECTUAL MINORITY)

[2] اسی کی ایک ادنیٰ شان ہے حضرت خالدؓ کا وہ قول جو انہوں نے غیر مسلم افواج سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ لوگو: تمہارا سابقہ اس قوم سے ہے جو موت کو اسی قدر عزیز جانتی ہے جس قدر تم زندگی کو ——!"

دورِ صحابہؓ کے اختتام کے ساتھ ہی فطری طور پر ایمان کی ان کیفیات میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اور عشق کی آگ ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی۔ نتیجۃً فوراً عقل کے قیل و قال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں 'عقل' پر کئی دور آئے اور ہر دور میں اس کے صغریٰ کبریٰ بدلتے رہے۔ لیکن مذہب کے 'نقل' کے ساتھ اس کا تصادم مسلسل جاری رہا۔ اور یہ پینترے بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوتی رہی۔ دوسری طرف سے حامیان و حاملانِ نقل اس کی جانب سے مدافعت کرتے رہے اور اس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں عقل اور نقل کے باہمی نزاع کا سلسلہ چلتا رہا۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مذہب کے نقل کی کامل عقلی توجیہہ نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی [1]

اس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی نہایت محدود ہے اور زمان و مکان اور ظروف و احوال کے بہت سے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے جبکہ دین و مذہب کی اساس جن وراء الوراء حقائق پر ہے وہ غیر محدود بھی ہیں اور نہایت لطیف بھی ——— شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حِکم کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں عقل اپنی جولانیاں جتنی چاہے دکھائے۔ ایمانیات و اعتقادات کی سرحد شروع ہوتے ہی معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

> واقعہ یہ ہے کہ ایمان جن غیر محدود، لطیف اور وراء الوراء حقائق کے مجموعے کا نام ہے ان کا مجرد نطقِ انسانی کی گرفت میں آنا بھی نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے، (جبھی تو اس مقام پر خود آسمانی کتابوں کو اشاروں، کنایوں، استعاروں اور تمثیلوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے!) ——— کجا یہ کہ انہیں ہر دور کی عقلی سطح پر وقت کے فلسفہ و منطق کے نہایت درجہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے!!

چنانچہ ——— یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عقائدِ اسلامی کی عقلی توجیہہ کی کوششوں سے بعض اوقات شدید نقصان بھی پہنچا۔ وقت کے فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھنے میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض حقیقی اجزاء کو کھوٹا بھی سمجھ لیا گیا اور وقت کی منطق کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض پہلو مجروح بھی ہوئے ——— اس کے مقابلے میں 'محفوظ' راستہ ہمیشہ ان ہی کا رہا جنہوں نے محض نقل پر اکتفا کیا۔ اسی کو سینے سے لگائے رکھا، اسی کے تحفظ میں زندگیاں کھپا دیں اور اسے جوں کا توں اگلی نسل تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے ——— بایں ہمہ

---

[1] یہ وہ 'محالِ عقلی' ہے جس کا منطقی امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس وقت جب علمِ انسانی ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے لئے حقیقتِ نفس الامری بالکل کھل جائے اور حقائقِ اشیا بالکل کما ہی روشن ہو جائیں ——— اور غالباً صرف آخرت ہی میں ہو سکے گا!!

جیسا کہ ہم نے عرض کیا چونکہ مذہب کے نقل کی عقلی توجیہہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے لہٰذا ہر دور میں دین و مذہب کے مخلصین اس کے لئے کوشاں رہے اور خود اپنے دین و ایمان کے لئے خطرات مول لے کر بھی اس خطرناک مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ایسے لوگوں کی ان تمام کوششوں کا اصل محرک خالص دینی ہی کا جذبہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ گمان کہ وہ دین و مذہب کے دشمن تھے یا ان کا مقصد ہی اسلام کو گزند پہنچانا تھا ایک شدید قسم کی زیادتی و ناانصافی ہے!

اصحابِ نقل کی جانب سے فطری طور پر ہر دور میں اصحابِ عقل پر تنقید بھی ہوتی رہی۔ لیکن اس کی بھی ہمیشہ دو سطحیں رہیں: ایک عوامی سطح جس پر مجرد ردّ و انکار اور اصحابِ عقل کی موشگافیوں سے بیزاری محض کا اظہار ہوتا رہا۔ اور دوسرے علمی سطح پر۔ ایسے لوگوں کے ذریعے جنہوں نے اپنے دور کے فلسفہ، منطق، علوم و فنون اور افکار و نظریات کے چشموں سے پوری طرح سیراب ہو کر اور اس طرح وقت کے عقلی معیار پر کامل پورے اتر کر ——— اور پھر خود ذہنی و عقلی اور قلبی و روحانی ہر اعتبار سے مذہب کے نقل پر مطمئن ہو کر اصحابِ عقل پر مدلل تنقید کی۔ درحقیقت دین و مذہب کا اصل دفاع ہر دور میں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس لئے کہ لوہا لوہے ہی سے کاٹا جا سکتا ہے اور عقل کا توڑ عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے!

اسلام کی تاریخ میں 'عقل' اور 'نقل' کا پہلا نزاع اس وقت برپا ہوا جب اسلام کے اصحابِ عقل نے یونان کے فلسفے اور ارسطو کی منطق کے زیرِ اثر اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششیں شروع کیں۔ اور اس کے نتیجے میں اسلام کے اساسی ایمانیات و اعتقادات میں منطقی موشگافیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ عقل و نقل کی وہ جنگ شروع ہو گئی جس کا آغاز تو اگرچہ دورِ اُموی کے آخری زمانے میں ہو گیا تھا۔ لیکن جو اپنے پورے شباب کو دورِ عباسی میں پہنچی۔ اس جنگ میں اوّل اوّل دو بالکل انتہائی نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کی کامل ضد تھے۔ چنانچہ 'عقلِ خالص' نے معتزلہ کا روپ دھارا اور 'نقلِ محض' نے اصحابِ ظاہر کی صورت اختیار کی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس 'آویزش' میں 'آمیزش' کا رنگ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معتدل نظام ہائے اعتقادی وجود میں آئے اور اشعری و ماتریدی عقائد باقاعدہ مرتب و مدوّن ہوئے اور عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے گوشۂ عافیت میں پناہ لی۔ خالص علمی سطح پر یہ نزاع بعد میں بھی جاری رہا اور امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ ایسے اصحابِ فکر و نظر عقلیت پرستی پر شدید عقلی ضربیں لگا کر 'نقل' کے دفاع کا مؤثر بندوبست کرتے رہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ معتزلہ اور اصحابِ ظاہر کے تصادم

کے نتیجے میں جو معتدل "مسلک اہل سنت" اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نظام ہائے اعتقادی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس کا اصل تانا بانا بھی وقت کے فلسفہ و منطق سے تیار ہوا ہے جس میں ایمان کے لازوال اور ابدی حقائق خوبصورتی کے ساتھ بُن دیئے گئے ہیں۔ گویا کہ اُسے عقل اور نقل کا ایک حسین امتزاج قرار تو دیا جا سکتا ہے لیکن ان تصریحات کے ساتھ کہ ایک تو اس میں اُس "حقیقت" کو جو لازوال و لافانی اور ازلی و ابدی ہے، عقل و منطق کے ان پیمانوں میں پیش کیا گیا ہے جو بالکل عارضی اور وقتی ہیں، دائمی و مستقل نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ ان عقائد کے منطقی و کلامی طرزِ بیان میں "حقیقتِ ایمان" بتمام کمال سمو دی گئی ہے۔ ——— ان عقاید کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک خاص دور کی عقلی سطح پر اور اس وقت کی متداول منطقی اصطلاحات میں "حقائقِ ایمانی" کی امکانی حد تک ترجمانی قرار دیا جا سکتا ہے اور بس!

دوسرے یہ کہ اس وقت بھی مذہب کا دفاع اور عقل و نقل کا یہ امتزاج صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا جو بیک وقت صاحبِ عقل بھی تھے اور حاملِ نقل بھی۔ بالکل یہی رنگ لوگ اس کام کے لئے اس وقت بھی بے کار تھے۔ چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مصنف خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے۔ اور "الرد علی المنطقیین" کے مؤلف خود ایک بہت بڑے منطقی تھے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو خود وقت کے فلسفہ و منطق کی گہرائیوں میں نہ اترا ہوا ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی لمبی ذکی جھنی کی جڑوں پر تیشہ چلا سکے۔

اسلام پر عقلیت کا دوسرا بڑا حملہ آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ کے اس فلسفہ و فکر کے زیرِ اثر شروع ہوا جس کی تعمیر خالص مادہ پرستی کی اساس پر ہوئی تھی۔ برّعظیم ہند و پاک میں یہ "جدید مذہبی عقلیت" متعدد اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قرطاس کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ جن میں جسٹس امیر علی کا نام بھی اگرچہ بالکل غیر اہم نہیں، تاہم ہر اعتبار سے اہم ترین نام سر سید احمد خاں مرحوم کا ہے۔ فکرِ اسلامی کے اس دور میں ان حضرات کا مقام بالکل وہی ہے جو دورِ قدیم میں قدیم معتزلہ کا تھا۔ یعنی مذہب کے نقل کے مقابلے میں عقل کی بالکل دوسری انتہا پر! ———

سر سید مرحوم کا قلبِ اسلامی کے ساتھ اخلاص تو ہر طرح کے شک و شبہے سے بالاتر ہے ہی، واقعہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے ساتھ مخلصانہ تعلق میں بھی شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ——— خاندانِ ولی اللہی کے سامنے میں وہ متشدد "وہابی" تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ایسا والہانہ تعلقِ خاطر تھا کہ جب ۵۸-۱۸۵۶ء میں سر ولیم میور کی کتاب "حیاتِ محمدؐ" شائع ہوئی جس میں آنحضورؐ کی سیرتِ مبارکہ پر ایک

حملے کئے گئے تھے تو وہ سخت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور بقول ان کے ان کا "جگر خون ہو گیا" اور انہوں نے لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں، اس کی اشاعت کے لئے رقم کی ضرورت ہو گی۔ تم اوّل تو راجہ جے کشن داس سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرو، ورنہ میری حق گڑھ والی کوٹھی فروخت کر دو!" ——— بایں ہمہ ان پر مغربی علوم و فنون اور خاص طور پر جدید سائنس کا ایسا رعب تھا اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ان پر اس قدر غالب آ گیا تھا کہ ان کی عینک سے جب انہوں نے دین و مذہب کا مطالعہ کیا تو اس کی بہت سی چیزیں انہیں ایسی نظر آئیں جن کو ماننے کے بعد اہلِ مغرب سے آنکھیں چار کرنا ان کے نزدیک دشوار تھا۔ چنانچہ دین و مذہب کی خیر خواہی انہیں اسی میں نظر آئی کہ ایسی چیزوں کی حتی الامکان تو عقلی و سائنٹیفک توجیہ کر دی جائے اور جن چیزوں کی توجیہ کسی طرح ممکن نہ ہو، ان کا انکار کر دیا جائے ———

چنانچہ ملائکہ محض قوائے طبعیہ (FORCES OF THE NATURE) قرار پائے۔ جن انسانوں ہی میں سے اجڈ، گنوار اور مشتعل مزاج لوگ ٹھہرے۔ معجزات کی خالص طبعی (PHYSICAL) توجیہ ہوئی۔ جنت اور دوزخ کو مقامات (PLACES) نہیں بلکہ صرف کیفیات (STATES) قرار دیا گیا۔ مذہبی رواداری کا راگ الاپا گیا۔ اور جہاد کے بارے میں معذرت خواہانہ روش اختیار کی گئی۔ دنیوی ترقی و عروج نظریات و افکار کی صحت کے ثبوت گردانے گئے اور مغربی تہذیب و تمدن اور طرزِ بود و ماند کو مسلمانوں کے جملہ قومی و ملی امراض کا واحد علاج ——— اور ان کے عروج و ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا ——— چنانچہ بالکل صاف کہا گیا کہ "مذہب کے علاوہ ہر بات میں انگریز بن جاؤ!" ——— اور نوبت بایں جا رسید کہ خود خدا کا تصور بھی حی و قیوم، سمیع و بصیر، رحیم و کریم، صاحبِ ارادہ و مشیت اور مقصود و منتقم ہستی کے بجائے سائنس کے علت العلل[1] (THE FINAL CAUSE) کی صورت اختیار کر گیا ——— اور وحی و قرآن کے بارے میں جو تصور اختیار کیا گیا اور "بے چارے" جبریلِ امینؑ کو جس طرح بیک بینی و دو گوش "رخصت" کیا گیا وہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق[2] است قرآنے کہ من دارم!

---

[1] واضح رہے کہ علت العلل اور مسبب الاسباب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

[2] اس شعر میں "معشوق" کا اطلاق جس طرح آنحضورؐ پر بھی ہو سکتا ہے اور خدا پر بھی بالکل اسی طرح کا قول ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ محمدؐ بھی ——— دونوں جگہوں پر اصل انکار جبریلِ امینؑ کا ہے ———!

گویا مذہب کی مکمل قلب ماہیت ہوگئی اور ہماری اپنی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق "مذہب کا خالص غیر مذہبی ایڈیشن تیار ہوگیا ——— بالکل ٹھیک کہا تھا حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کہ ؎

دیکھو کاریگری حضرت سید اے شیخ

دے گئے وضع وہ مذہب میں کمائی کی طرح

ہم نے سرسید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے یہ چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت، خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں، درحقیقت فکر سرسید ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسید بے چارے تو پھر بھی معذور تھے اس لئے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی قوم کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی و عسکری قوت بھی بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے ان جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں درآنحالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی "خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کر چکی، سائنس کی مادہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی، اور مغرب کی سیاسی و عسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی! ؏

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

بہرحال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکر سید کی ہے۔ شخص سرسید تو بہت جلد اپنے رب سے جا ملا لیکن فکر سرسید در اصل تاریخ اسلامی کا ایک دور ہے جو تا حال جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے جو پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر میں قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا تعلق علی گڑھ سے وہی ہے جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانۂ کعبہ کے ساتھ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاک و ہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی مکتبۂ فکر سے متعلق و منسلک ہیں جس کی ابتدا سرسید مرحوم نے کی تھی۔

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ و قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا۔ ہم پہلے بھی یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کی حفاظت کا موثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ دریں بہاں کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی و مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانۂ کعبہ کے ساتھ۔ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس و میلاد اور فاتحہ و درود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق و منسلک ہیں۔

تحریک دیوبند کی ان مختلف شاخوں کے مابین مجموعی مزاج اور دائرہ ہائے کار کا فرق و امتیاز بھی ایک دلچسپ علمی موضوع ہے ان میں اصل عوامی عنصر جو مذہب و سیاست دونوں کا مظہر یا بالفاظ دیگر مذہبی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ذہناً و قلباً "جمعیتی" ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ذہنی تعلق اور قلبی ارادت و عقیدت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام بھی درحقیقت اسی کا تتمہ یا صحیح تر الفاظ میں ضمیمہ ہے۔ تھانوی اور عثمانی حلقے علمی ذوق اور متفکرانہ مزاج کے حامل ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا یوسف بنوری کا مزاج خالص علمی ہے ——— اور تبلیغی جماعت خالص غیر سیاسی و غیر علمی لیکن نہایت پرجوش و فعال مذہبیت کا مظہر ہے ——— ان تمام امتیازات کے علی الرغم جہاں تک مذہبی فکر کا تعلق ہے وہ ان سب میں مشترک ہے۔ مذہب کے نقل کے سب ایک سے فدائی ہیں۔ اور قال اللہ و قال الرسول ہی نہیں اس کی بھی ایک متعین صورت یعنی مسلک حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن و سنت کا معروضی (OBJECTIVE) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حکم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑا علمی شغل ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری و ماتریدی عقاید اور فقہ حنفی کے لئے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کئے جائیں ——— دوسری طرف جدید علوم و فنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبعیات، کیمیا، فلکیات، حیاتیات، نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ فراہم کیا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ و منطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات، اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلا واسطہ علم انہیں حاصل نہیں ——— گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی و فکری اعتبار سے خالصتہً آج سے کم از کم دو سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں سے کچھ حضرات اپنی تحریر و تقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسد ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحر محیط میں دو رو دھارے بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیحدہ علیحدہ بعینہٖ اسی کیفیت کے ساتھ چل رہے ہیں جس کا نقشہ سورۂ رحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ:-

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝	چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے (بھی) ہیں (اور) ان کے
بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝	مابین ایک حجاب (بھی) ہے (جس سے) بڑھ نہیں سکتے۔

ان دو متضاد فکری و تہذیبی سوتوں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیوبند کا اور پوری ملت دو نمایاں طور پر مختلف مکاتب فکر و نقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک مضر اور مایوس کن ——— ایک جانب جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی ہے لیکن ملحدانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان و اسلام ہے لیکن جمود و ... اور قدیم فلسفہ و منطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتب فکر کو علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تا حال ان کے مابین امتزاج کی کوئی موثر صورت

پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے دین میں ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر و بیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرم اور تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملتِ اسلامی کی اس وقت کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ اس آویزش میں کسی واقعی و حقیقی 'آمیزش' کا رنگ تا حال پیدا نہیں کیا جا سکا ———

غرض کہ یہ ہے وہ علمی و فکری پس منظر جس کی روشنی میں ڈاکٹر فضل الرحمان کی تازہ تصنیف 'اسلام' کی اشاعت اور اس کے خلاف عوامی ردِ عمل کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا تو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ بات اتنی طویل ہو جائے گی۔ اس اشاعت میں جتنی جگہ اس موضوع کے لئے پہلے سے رکھی گئی تھی وہ ختم ہو گئی ہے لہٰذا مجبوراً اس صحبت میں بات یہیں چھوڑی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اشاعت میں ہم اس موضوع کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالیں گے اور اس مسئلے کے حل کی راہ بھی واضح کریں گے ——— وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

گزشتہ اشاعت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ بالعموم پسند کیا گیا۔ زیرِ نظر شمارے میں ان کا ایک اور مضمون 'صحیح نظامِ تعلیم اور پاکستان' کے موضوع پر شائع کیا جا رہا ہے۔ قدیم و جدید، دینی اور دنیوی دو نظام ہائے تعلیم کا وجود ایک بالکل غیر منطقی اور غیر معقول بات ہے اور ان کا امتزاج (INTEGERATION) وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس نئے نظامِ تعلیم کے خدوخال کیا ہوں؟ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس مسئلے کے اصل بنیادی مسئلے سے بہت کم تعرض ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی فکری اساس اور فلسفیانہ بنیاد کیا ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ان کی اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان کا ذہن خاصا منقح ہے۔ اور پاکستان کے مستقبل کے نظامِ تعلیم کا واضح نقشہ ان کے ذہن میں موجود ہے ——— خدا کرے کہ ہمارے نظامِ تعلیم کے اربابِ بست و کشاد ان خیالات پر سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمان کے استعفے نے پاکستان میں سرکاری، غیر سرکاری اور نیم سرکاری تمام سطحوں پر ہونے والے "اسلامک ریسرچ" کے کاموں کے سلسلے میں اس اساسی و بنیادی سوال کو از سرِ نو سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ اس کے صحیح خطوط کیا ہو سکتے ہیں اور اسے صحت مند راہوں پر کس طرح آگے بڑھایا جا سکتا ہے کہ یہ وقت کی جملہ ضرورتوں اور عصرِ حاضر کے تمام تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے اور عوام کی روایات اور ان کے مذہبی معتقدات اور احساسات و جذبات سے بھی متصادم نہ ہو۔ خوش قسمتی سے اس موضوع پر بھی ڈاکٹر صاحب کا ایک نہایت عمدہ علمی مقالہ بزبانِ انگریزی (THE MEANING & PURPOSE OF ISLAMIC RESEARCH) کے عنوان سے موجود ہے جس کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اسلامی ریسرچ کا اتنا واضح اور اس قدر صحیح تصور اس سے قبل ان کی نظر سے نہیں گزرا ——— ہم ان شاء اللہ اگلے شمارے میں اس اہم اور گرانقدر مقالے کا ترجمہ شائع کریں گے۔ خدا کرے کہ ہماری ملی زندگی کے اس شعبے کے ذمہ دار حضرات اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور ایک ایسی راہ اختیار کریں جس سے مسائل کا واقعی حل سامنے آئے اور اس غریب قوم کا جو سرمایہ ان کاموں پر صرف ہو رہا ہے وہ ضائع نہ ہو بلکہ مفید نتائج پیدا کرے ——— آمین یا رب العالمین!

انوارِ مجددیؒ

تلخیص و ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

شریعت و طریقت

• ——— ماخوذ از مکتوب ۳۶ دفتر اوّل، بنام مُلّا حاجی محمد لاہوری

[خلاصہ مکتوب: شریعت محمدی دنیا اور عقبیٰ کی تمام سعادتوں کی ضامن ہے، اس مقصدِ عظمیٰ کے حصول کے لیے شریعت کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اور طریقت و حقیقت دونوں شریعتِ محمدی کی خادم ہیں، نہ کہ امر زائد —]

"(۱) — واضح ہو کہ شریعت کے تین اجزا (حصّے) ہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص۔ جب تک یہ تینوں اجزا ثابت نہ ہوں، شریعت کا اثبات (تحقق) نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک یہ نہ ہو، رضائے الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور رضائے الٰہی، تمام سعادتوں سے برتر اور بڑھ کر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ" اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت اور سعادت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ شریعت کے علاوہ کسی چیز کی حاجت نہیں ہے

(۲) طریقت اور حقیقت جن کے ساتھ صوفیہ ممتاز ہیں۔ یہ دونوں

شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ ان کی تحصیل سے مقصود صرف شریعت کی تکمیل ہے۔ احوال، مواجید، علوم اور معارف جو صوفیا کو اثنائے راہ میں حاصل ہو جاتے ہیں، مقصود نہیں ہیں۔ صوفی کا مقصد تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی (رضا) حاصل کرنا ہے۔ جسے اصطلاح میں مقامِ رضا کہتے ہیں اور یہی مقام، جذبہ اور سلوک (سیرِ انفسی اور سیرِ آفاقی) کی انتہا ہے۔

(۴) جو لوگ اپنی غلط فہمی کی بنا پر احوال و مواجید یا کشف و کرامات کو مقصود سمجھتے ہیں وہ کمالاتِ شریعت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ احوال و مواجید، مقدمہ، مقصود ہیں نہ کہ مقصود۔ اور مجھے یہ حقیقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے صدقے میں اس راہ میں کامل دس برس تک چلنے کے بعد معلوم ہوئی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰالِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا۔"

ہم سے طلب فرمائیں

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات کا سلیس اور شگفتہ
ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ
از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰x۳۰/۱۶ صفحات ۴۸۴ مجلد مع ڈسٹ کور۔ قیمت چار روپے (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

دار الاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سُورۂ مائدہ۔ (۶)

۱۸۔ آگے کا مضمون، آیات ۵۱-۶۶

آگے مسلمانوں کو پہلے عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر آگاہ فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور دوست نہ بناؤ، جو لوگ ان کو اپنا معتمد اور دوست بنائیں گے وہ ادعائے ایمان کے باوجود انہی میں شمار ہوں گے اور ان کا حشر انہی کے ساتھ ہو گا۔ پھر ان منافقین کے باطن سے پردہ اٹھایا اور بتایا ہے کہ یہ کفر کی راہ میں جو سبقت کر رہے ہیں اس کے محرکات کیا ہیں اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی روش ارتداد کی روش ہے اور اگر یہ ارتداد اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کریں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر یہ مرتد ہو جائیں گے تو اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو ایمان و اخلاص کے تمام اوصاف سے متصف ہوں گے، خدا ان سے محبت کرے گا، وہ خدا سے محبت کریں گے، وہ اللہ کی پارٹی بنیں گے اور یہی پارٹی بالآخر غالب ہو گی۔

اس کے بعد ان منافقین کو غیرت دلائی ہے کہ آخر تم ان لوگوں کو کس طرح اپنا دوست اور معتمد بناتے ہو جو علانیہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ پھر اہل کتاب کو ان کی ان شرارتوں پر سرزنش فرمائی اور ان کے اس انجام سے ان کو آگاہ فرمایا جس کے

وہ اپنی ان بدبختیوں کے سبب سے سزاوار ٹھہرے۔ اسی ضمن میں ان کے علماء اور فقہاء کو بھی
سرزنش فرمائی کہ اگر وہ ان کو ان بیہودگیوں اور حرام خوریوں سے نہیں روکتے تو آخر وہ کس مرض
کی دوا ہیں۔ آخر میں یہ واضح فرمایا کہ یہ تمام شرارتیں جو یہ دین حق کے خلاف کر رہے ہیں اللہ
ان میں سے کسی کو بھی کامیاب نہ ہونے دے گا بلکہ یہ ہر قدم پر منہ کی کھائیں گے۔ بہتر ہوتا کہ
یہ اچھی روش اختیار کرتے اور اللہ کے انعام کے سزاوار بنتے لیکن ان پر ان کی شامت مسلط ہو چکی
ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

المائدة ۵ ۵۱-۶۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا
فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ
يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ ۵۵
وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ
الْغٰلِبُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ
هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ
اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ
وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ
اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ
فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۶۲
لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ
السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ۶۳ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ
غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ
كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ
فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ۶۴ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ
اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ
رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ
مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۶۶

ترجمہ

اے ایمان والو، تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک
دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی
میں سے ہے۔ اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ تم ان لوگوں کو، جن کے دلوں
میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ ان کی طرف پینگیں بڑھا رہے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ
ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے
کوئی خاص بات دکھائے، اور انہیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے
ہیں، نادم ہونا پڑے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ کیا یہی لوگ ہیں جو

بڑے زور و شور سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے۔ ۵۱ - ۵۳

اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو اللہ کو کوئی پروا نہیں، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابل میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔

تمہارے دوست اور معتمد تو بس اللہ، اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ۔ اور جو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بناتے ہیں تو وہ اللہ کی پارٹی ہیں اور اللہ ہی کی پارٹی ہے جو غالب رہنے والی ہے۔ ۵۵ - ۵۶

اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور نہ کفار کو۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو کہ اے اہل کتاب، تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ کہو کیا میں تمہیں باعتبار انجام اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برے لوگوں کا پتہ دوں؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔ ۵۷ - ۶۰

اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے اور اسی کے ساتھ نکلتے ہیں، اور اللہ خوب واقف ہے اس چیز سے جس کو وہ چھپا رہے ہیں۔ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں۔ کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں!

ان کے علما اور فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟ کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں! ۶۱ - ۶۳

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو۔ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی ہے۔ اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دے گا۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۶۴

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے خدا کا رزق و فضل پاتے۔ ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے لیکن زیادہ ان میں ایسے ہیں جن کے عمل بہت برے ہیں۔ ۶۵ - ۶۶

۱۹ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ
مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

خطاب اگرچہ مسلمانوں سے عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۴۱ سے چلا آ رہا ہے اور جن کی صفت 'الذین یسارعون فی الکفر' بیان ہوئی ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ ہم 'سمٰعون لقوم آخرین' کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہود کے زیر اثر تھے، اور دعویٰ اگرچہ ایمان کا کرتے تھے لیکن عملاً یہود کی مقصد برآریوں میں ان کے آلۂ کار اور ان کے ایجنٹ تھے۔ ان کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد اور کارساز نہ بناؤ۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ

دوست بنانے کی یہ ممانعت 'من دون المومنین' کی قید کے ساتھ وارد ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابل میں ان کو دوست نہ بناؤ۔ اگر یہ موالات اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہو یا کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

'بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس معاملے میں انفرادی مصالح اور انفرادی مراسم کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان یہود یا نصاریٰ میں سے کسی فرد یا گروہ کو اچھا سمجھے یا اس کے ساتھ اس کی کوئی ضرورت وابستہ ہو یا سابق رشتہ داری ہو اور اس چیز کو وہ ان کے ساتھ ربط ضبط قائم رکھنے کے لیے عذر بنائے لیکن یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی بنیاد پر نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیت جماعت ملت واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان ان کے مقابل میں ملت واحدہ بنیں، ملت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و مراسم کی بنا پر اعتماد و دوستی کا ربط ضبط نہ بڑھائے۔

'وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ' یعنی جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور معتمد بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا۔ اس کا دعوائے اسلام بالکل بے حقیقت ہو کے رہ جائے گا۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' ہدایت سے یہاں مراد، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، منزل اور مقصود کی طرف ہدایت ہے اور 'ظالمین' سے مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہل ایمان کے مقابل میں ایمان و اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنائیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور ایسے لوگ راہ یاب نہیں ہوں گے اس لئے کہ انہوں نے 'سواء السبیل' پر چلنے والے قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ
نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ

عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ (۵۲-۵۳)

'فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ' 'ف' یہاں تفصیل کے لئے ہے اور خطاب، عام مسلمانوں سے ہے۔ اوپر کی آیت میں جو بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی تھی اور پردے میں تھی اب پردہ اٹھا کر اس کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ان سے پینگیں بڑھا رہے ہیں، ان کا مدعا کیا ہے اور بالآخر ان کا انجام کیا ہونا ہے۔ فرمایا کہ جن کے دلوں میں مرض ہے وہ ان کے ساتھ دوستی گانٹھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ 'مرض' کے لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ نفاق ہے۔ نفاق کے لئے مرض کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ واضح فرما دیا کہ ان لوگوں کی یہ حرکت دل کی بیماری اور اس کے فساد کا نتیجہ ہے، اگرچہ یہ اس کو اپنی بڑی دانش مندی اور دور بینی سمجھتے ہیں۔

'يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ' 'قول' کا لفظ جی میں کوئی بات کہنے کے لیے بھی قرآن میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے آگے اس کو کھول بھی دیا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے۔ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (یعنی وہ جو کچھ اپنے دل میں چھپائے ہوتے ہیں اس پر نادم ہوں گے) ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی بات کی طرف ہے جس کا ذکر 'نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ 'دائرۃ' کے معنی گردش، آفت اور مصیبت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان مخالفین کے دل میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین میں جو کشمکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، ہو سکتا ہے کہ بالآخر فتح مخالفین ہی کی ہو۔ ایسی صورت میں اگر ہم مسلمانوں ہی کے بن کے رہ گئے تو سخت مصیبت میں پھنس جائیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس زمانے تک، جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں، مسلمان اگرچہ ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے لیکن ابھی ان کو مکمل اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا، اپنے اپنے دائروں میں یہود اور قریش بھی با اقتدار تھے، اگرچہ یہ اقتدار رو بہ زوال تھا۔ لیکن منافقین کا قلبی رشتہ چونکہ ان مخالف اسلام طاقتوں ہی کے

ساتھ تھا۔ اس وجہ سے وہ سانی کے ساتھ یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابل میں اب ان کے ٹک سکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

'فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَا اَسَرُّوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ'، 'عَسٰى'، اگرچہ اصلاً امکان غالب اور ظن غالب ہی کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن موقع دلیل ہو تو، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں، یہ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اسلوب ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔ 'بالفتح' سے مراد وہ آخری اور مکمل فتح ہے، جس کے بعد دشمن کی قوت بالکلیہ ختم ہو جائے 'اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ' سے ایسی کوئی صورت مراد ہے جس سے منافقین کا سارا بھانڈا پھوٹ جائے اور ان کے لیے کہیں منہ چھپانے کی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ سورہ توبہ میں اس کی ایک شکل یہ بیان ہوئی ہے یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۶۴ - توبہ (منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے باب میں کوئی ایسی سورہ نہ نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کے سارے راز ان پر آشکارا کر دے، کہہ دو، مذاق کر لو، اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس کا تم اندیشہ رکھتے ہو۔)

فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَا اَسَرُّوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔ میں ان کے اسی خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ یہ اسلام کی طرف یکسو ہو جانے میں اپنے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ناک ہیں کہ اگر فتح یہود اور مشرکین کی ہوئی تو یہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیہ، یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت کا اظہار تعجب نقل ہوا ہے جب ان کا سارا راز فاش ہو جائے گا، اس وقت مسلمان آپس میں کہیں گے، ارے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے قسمیں کھا کھا کے ہمیں یقین دلاتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں!۔ مقصود اس صورت حال کی تصویر سے منافقین کو جھنجھوڑنا ہے کہ کب تک چھپنے اور چھپانے کی کوشش کرو گے، بالآخر ایک دن برسرعام رسوائی ہونی ہے۔

'حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ'، مسلمانوں کے قول کا ایک حصہ بھی ہو

سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان منافقین کے انجام کا بیان بھی۔ ہمارا رجحان اس دوسرے پہلو کی طرف ہے۔ 'حبط عمل' کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اعمال کے مثمر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائش ہوتی ہے، حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭوَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ - ۵۴

خطاب بظاہر عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جو ...... اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ ان کی یہ روش دین سے ارتداد کی روش ہے۔ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آنا چاہتے تو جائیں مرتد ہو جائیں، خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں۔ اس طرح کے جملوں میں عربیت کے عام قاعدے کے مطابق جواب شرط محذوف ہوتا ہے جو سیاق کلام سے واضح ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ۔ ان صفات کے بیان سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ زمین میں اپنے دین کا گواہ اور علم بردار بنا کر کھڑا کرتا ہے ان کی صفات کیا ہوتی ہیں یا کیا ہونی چاہئیں۔ دوسرا یہ کہ یہ منافقین ان صفات کے بالکل برعکس صفات کے حامل ہیں گویا براہ راست ان کے عیوب گنانے کے بجائے ان کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دیا گیا ہے جس میں وہ اپنے سارے عیوب خود دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اظہار حقیقت کا ایک نہایت بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے۔

يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ، (ان سے خدا محبت کرے گا اور وہ خدا سے محبت کریں گے)، اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ نہ خدا ان منافقین سے محبت کرتا نہ یہ خدا سے محبت

کرتے بلکہ خدا ان سے نفرت کرتا ہے اور یہ خدا سے بیزار و بے پروا ہیں۔ خدا کی محبت کسی کے نام و نسب، شکل و صورت اور مال و جاہ سے نہیں بلکہ ایمان و عمل اور اخلاق و کردار سے ہوتی ہے جب اس اعتبار سے یہ نہ صرف صفر بلکہ خدا کی پسندیدہ صفات کے بالکل برعکس صفات سے متصف ہیں تو یہ خدا کی محبت کے حقدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا سے محبت کی شہادت یہ ہے کہ یہ خدا کے احکام و ہدایات اور اس کے نبی کے طریقہ اور فیصلہ کے پابند ہوں لیکن جب یہ اللہ کے فیصلہ کو چھوڑ کر جاہلیت کے فیصلہ کے طالب اور اللہ و رسولؐ اور اہل ایمان کو دوست بنانے کے بجائے اللہ و رسولؐ کے مخالفین یہود و نصاریٰ اور کفار سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں تو خدا سے بیزار ہونے کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۳۱ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

'اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین'۔ 'اذلۃ' 'ذلیل' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ، جیسا کہ آل عمران کی آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو ناقۃ ذلول کہتے ہیں۔

'اعزۃ' 'عزیز' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، غیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'ھو عزیز علیّ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ یہی مفہوم 'شدید علیّ' کا بھی ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے؛

اذا المرء عیتہ المروءۃ ناشئاً فمطلبھا کھلاً علیہ شدید

اگر کسی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑ پن میں اس کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے، اور ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے

کی جگہ نہ پا سکیں گے۔ مسلمانوں کی یہی تعریف ایک حدیث میں بھی وارد ہے۔ المومن غر کریم۔ مومن اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھولا بھالا اور شریف و کریم ہوتا ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور سانپ کے مانند ہوشیار بنو۔ اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔

ان صفات کے بیان سے بھی مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے جو بالکل اس کے برعکس واقع ہوا تھا یعنی وہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے تو بڑے ہوشیار اور گھاگھ تھے، کچھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے، لیکن یہود اور مشرکین کے ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی تھے۔ وہ جس طرف چاہتے ان کو موڑتے اور جس طرح چاہتے ان کو نچاتے۔ اس مضمون پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ فتح کی آیت محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (محمد رسول اللہ ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابل میں سخت اور آپس میں مہربان و نرم دل ہیں) کے تحت آئے گی۔

'یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم'۔ جہاد سے مطلب یہاں صرف قتال ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ جد و جہد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ اس میدان میں اترنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دوسرے مفادات اور دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے اترے۔ جو شخص ہر گام پر پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا۔ عرب شعراء جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کا مضمون باندھتے ہیں تو اس کی تمہید میں ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر ضرور کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی یہ سب سے پرانی اور ناگزیر آفت ہے، ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم و جزم کا کام کرنے اٹھے اور دہنے بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں۔ یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی دامن جھٹک کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو تو اکثر وہ اسی پہلے ہی مرحلے میں دھر لیا جاتا ہے۔

اس صفت کے بیان کرنے سے بھی مقصود منافقین کے کردار پر عکس ڈالنا ہے کہ دعی تو یہ بنے ہیں ایمان کے اور قدم رکھا ہے انہوں نے عشق کے کوچے میں لیکن پیچھے کے مفادات بھی دامن گیر ہیں

اور مستقبل کے خطرات سے بھی ہوش اڑے جا رہے ہیں اور پوری فراخدلی اور نیازمندی کے ساتھ ان ہمدردوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں کا احترام بھی انھیں ملحوظ ہے جن کے پھندوں میں گرہ شیطان نے لگائی ہے اور جن سے بچ کے نکل جانا بڑے ہی صاحب توفیق کا کام ہے۔

'ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم'۔ یعنی اللہ کا اصل فضل یہ ہے اور اس کے سزاوار وہ بنتے ہیں جن کو وہ چاہتا ہے۔ "جن کو وہ چاہتا ہے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ خدا کی مشیت اس کی کامل قدرت اور اس کے کامل علم و حکمت کے ساتھ ہے اور جہاں مشیت کامل قدرت اور کامل علم و حکمت کے ساتھ ہو وہاں کسی حق تلفی و ناانصافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ مشیت کے بیان کے ساتھ 'واللہ واسع علیم' کی صفات کا حوالہ دینے سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آخر اس وقت مسلمانوں کے اندر ان صفات کے حامل بھی تو موجود تھے بلکہ اکثریت ان صفات کے حاملین ہی کی تھی تو قرآن نے یہ کیوں کہا کہ "خدا ایسے لوگوں کو لائے گا" آخر ان لوگوں کا حوالہ کیوں نہ دیا جو موجود تھے اور ان صفات کے بہترین حامل تھے۔ اس سوال کا جواب اوپر گزر چکا ہے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے عام ہے لیکن روئے سخن اصلاً منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم مرتد ہو گئے تو خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا، خدا تمہاری جگہ اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کرے گا جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہوں گے۔ گویا یہ فرما کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین کے اس غم کو دور کیا گیا ہے جس کا ذکر اوپر 'لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر' والی آیت میں ہوا ہے کہ پیغمبر اور اہل ایمان ان منافقین کی کفردوستی سے غمگین نہ ہوں، اگر یہ نکل گئے تو ان کے نکل جانے سے اللہ کے دین کا کچھ نہیں بگڑے گا، ان کی جگہ اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے دوسری تازہ دم فوج لائے گا جو ان تمام کمزوریوں اور بیماریوں سے پاک ہو گی جو ان کے اندر موجود ہیں۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ۝ ۵۵-۵۶

آیت ۵۱ میں جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی تھی وہی بات اب مثبت پہلو سے کہی جا رہی ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد نہ بناؤ بلکہ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست اور اپنا معتمد بناؤ۔ تمہارا ایمان (اگر وہ موجود ہے تو) تم کو ان سے جوڑتا ہے، نہ کہ ان سے۔ 'والذین آمنوا'۔ یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے یعنی مومنین مخلصین۔

ایمان کی عملی تعبیر نماز اور زکوٰۃ ہے

'الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون' یہ 'للذین آمنوا' سے بدل ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کی عملی تعبیر اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ عطف کے بجائے بدلیت کے اسلوب سے اس کو تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمت شریعت کے پہلو سے ایمان اور نماز و زکوٰۃ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ دونوں بالکل لازم ملزوم ہیں۔ جہاں ایمان موجود ہے نماز اور زکوٰۃ لازماً موجود ہوں گی۔ اگر یہ غائب ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ایمان بھی غائب ہے۔ اگر اس کا دعویٰ ہے تو یہ محض دعویٰ ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کی اصل روح

'وھم راکعون'۔ 'رکوع' یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے عام لغوی مفہوم میں ہے۔ 'رکع الرجل' کے معنی ہوتے ہیں 'افتقر و انحطت حالہ' اس وجہ سے فروتنی، افتقار، نیازمندی، عاجزی اور دل شکستگی اس لفظ کی اصل روح ہے۔ نماز میں رکوع، درحقیقت آدمی کے دل کی اسی حالت کی تعبیر کی ایک عملی شکل ہے۔ یہاں اس قید کے لگانے سے مقصود نماز اور زکوٰۃ کی اصل روح کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ جس طرح نماز اور زکوٰۃ کے بغیر ایمان بے معنی اور بے روح ہو کے رہ جاتا ہے اسی طرح دل کی فروتنی اور خستگی کے بغیر نماز اور روزہ بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اسلام کے دور اول میں منافقین کو نماز بھی پڑھنی پڑتی تھی اور زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس کے بغیر اس عہد مبارک میں کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرا ہی نہیں سکتا تھا لیکن سورہ نساء میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے کہ ان کی نمازیں مارے باندھے کی ہوتی تھیں، قرآن میں ان کے لیے 'کسالیٰ' کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح ان کا انفاق محض نمائش کے لیے ہوتا تھا۔ 'وھم راکعون' کی قید نے یہ واضح کیا کہ دین میں جو نماز و زکوٰۃ مطلوب ہے وہ دل کی خستگی اور فروتنی کے ساتھ مطلوب ہے، ریا، تکبر اور کراہت کے ساتھ نہیں۔

حزب اللہ

'ومن یتول اللہ ورسولہ والذین آمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون' میں ایجاز کلام کے تقاضے سے ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ جو اللہ اور اس کے

رسول اور اہلِ ایمان کو اپنا دوست بناتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت ہے جو غالب ہونے والی ہے۔ چونکہ آخر کا ٹکڑا خود محذوف پر دلیل تھا اس وجہ سے پہلے کو حذف کر دیا۔ اوپر فرمایا تھا کہ جو لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں وہ ایک دن اپنے کیے پر پچھتائیں گے، ان کے اعمال ڈھے جائیں گے، وہ نامراد ہوں گے۔ اب یہ اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو دوست بنانے والوں کے روشن انجام کو واضح فرما دیا اور ان کو 'حزب اللہ' کے لقب سے ملقب کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ یہ منافقین جو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنا رہے ہیں یہ حزب الشیطان ہیں۔ اور شیطان کا کید چونکہ ضعیف اور بودا ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی ناکامی و نامرادی ان کی تعبیر ہی کے اندر مضمر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ ۵۷-۵۸

دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی غیرتِ ایمانی کے خلاف ہے۔

اب یہ ان کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ جو اہلِ کتاب اور کفار تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور تمہارے شعائرِ دین کو کھیل تماشہ بناتے ہیں حیف ہے اگر تم ان کو اپنا دوست بناؤ۔ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہو یا جس کی طرف وہ منسوب ہو اس کی توہین و تذلیل وہ برداشت نہیں کرتا، اگر کوئی اس کو گوارا کرے تو یہ اس کی بے حمیتی کی دلیل ہے۔ عرب کے لوگ اس معاملے میں بڑے حساس تھے۔ دین تو بڑی چیز ہے وہ اپنے خاندان یا اس کے کسی فرد کی توہین و تذلیل پر بھی آگ بگولا ہو جاتے اور تلواریں سونت لیتے۔ اس انسانی فطرت کے پہلو سے قرآن نے ان کو ملامت کی ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں آخر کس دل و جگر سے تم ان کو دوست بناتے ہو؟ اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی کہ 'اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو'، یعنی اگر تم سچ مچ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو کہ اس بے حمیتی پر تمہارا ایمان نہ سلب ہو جائے اور خدا کا غضب نہ نازل ہو جائے۔

'وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ' الایۃ یہ ذکر ہے اس چیز کا جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اشارہ اذان کی طرف ہے۔ یہودی اشرار جس طرح مجلسِ نبوی میں مختلف قسم کی بدتمیزیاں کرتے تھے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اسی طرح ان کے اراذل و اشرار اذان کی بھی بھونڈے طریقے پر نقلیں کرتے

اور اس پر ہنستے ہنساتے۔ اذان، اللہ کی بندگی کی دعوت ہے۔ اس کا مذاق اڑانا بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے، جو کتابِ الٰہی کے حامل بنائے گئے ہوں، خود خدا کی تحقیر اور اس کے مذاق اڑانے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی مسلمان ان سے دوستی رکھے۔ اگر کوئی شخص ان سے دوستی رکھتا ہے اور ایمان کا مدعی بھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیرتِ ایمانی سے خالی ہے اور غیرتِ ایمانی سے خالی شخص اپنے ایمان کی کبھی حفاظت نہ کر سکے گا ——

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا احترام انسان کے ذی عقل ہستی ہونے کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے محروم ہے تو وہ صرف دینداری ہی سے محروم نہیں ہے بلکہ عقل سے بھی محروم ہے۔

اذان شعائرِ الٰہی میں سے ہے۔

اس آیت سے اذان کے عظیم شعائرِ الٰہی میں سے ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اذان کا آغاز ملت میں کس طرح ہوا؟ اس سوال کے جواب میں، بربنائے اختلافِ روایات، اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن اس امر میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ جس شکل میں یہ موجود ہے اس کو امت کے تواترِ قولی و عملی کے ساتھ اللہ اور اس کی کتاب کی تصدیق و تصویب بھی حاصل ہے۔ اس وجہ سے اس کو کسی اور شکل میں بدلنے کی کوشش دین میں ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ شعائر کا معاملہ دین میں بڑا اہم ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ خاص اذان کے مسئلہ پر انشاء اللہ سورہ جمعہ کی تفسیر میں ہم مزید بحث کریں گے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ۝ ۵۹-۶۰

'نقم' کے معنی، 'انتقام لینے'، 'بدلہ لینے' اور 'کسی پر غصہ نکالنے' کے ہیں۔

یہود کی ازراہِ [illegible]

اوپر یہود کی جو شرارت بیان ہوئی اس کے تعلق سے اب کلام کا رخ یہود کی طرف مڑ گیا۔ ان کو مسلمانوں کی طرف سے کہلایا جا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ تمہاری اس ساری دشمنی اور شرانگیزی کی علت اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری نیکی تمہارے نزدیک بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا کیا جرم ہے؟ یہی نا، کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کتاب پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی ایمان لائے جو پہلے اتاری گئیں، برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں

سے اکثر فاسق ہیں، نہ اس کتاب ہی پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی اور نہ اس کتاب ہی پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جو ہم کو عطا ہوئی! فرمایا کہ ان سے کہو کہ تمہارے نزدیک تو اس دنیا میں ہم سب سے برے ہیں اور اس کے سبب سے تم ہمارے درپے آزار و انتقام ہو لیکن کچھ پتہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے نزدیک اپنے انجام کے لحاظ سے سب سے برا کون ہے! یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی ـــ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے سب سے برے اور شاہراہ حق سے بعید تر ہیں۔

مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ میں ہمارے نزدیک مضاف محذوف ہے جس طرح وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں ہے۔ یعنی مثوبة من لعنه الله۔

'الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ' اصحاب السبت کی لعنت کے سلسلہ میں 'قردہ' پر بحث گزر چکی ہے۔ انسان کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان سے جب عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جائے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کے رہ جائے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہی ہوتے رہتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت بیں ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں اگرچہ اس کو غازہ اور پوڈر سے کتنا ہی چھپانے کی کوشش کی جائے۔ انسان اپنی مادی خلقت کے اعتبار سے گوشت پوست سے بنا ہوا ایک حیوان ہی ہے، بعض حیوان دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، بعض چار پر۔ انسان کو انسانیت کا جمال اس شعلہ نورانی سے حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن نے 'نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ شعلہ یزدانی بجھ جائے تو پھر انسان کو بھی دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور سمجھئے جو اپنی سرشت کے اعتبار سے بندر اور خنزیر بھی ہو سکتا ہے، کتا اور گدھا بھی۔ چنانچہ یہود کی مثال قرآن میں کتے اور گدھے سے بھی دی گئی ہے۔ اس معاملے میں نگاہ اور نگاہ کے درمیان بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ جن نگاہوں کی رسائی صرف صورت اور لباس ہی تک ہے ان کے لیے آدمی اور غیر آدمی میں فرق کرنا ناممکن ہے لیکن جو نگاہیں باطن میں گھسنے کی عادی ہیں وہ بادنیٰ تامل اندازہ کر لیتی ہیں کہ فلاں صورت کے اندر بندر چھپا ہوا ہے یا خنزیر، کتا چھپا ہوا ہے یا گدھا۔ انبیاء اور عارفین کے ملکوتی مشاہدات میں ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر طوالت

کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بعض مثالیں یہاں پیش کرتے۔

'وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ' کا عطف اوپر مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ الاٰية پر ہے اور یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ کا مضاف محذوف ہے یعنی مثوبة من لعنه الله، اس وجہ سے یہاں بھی مضاف محذوف ہوگا یعنی مثوبة من عبد الطاغوت)۔ مطلب یہ ہوگا کہ جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی وہ اپنے انجام کے لحاظ سے بدتر ہوں گے۔ یہاں سزا کے بجائے جرم کا ذکر اس کی خاص اہمیت کی وجہ سے فرمایا کہ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر طاغوت کی پرستش کی ہے وہ اپنے انجام کی فکر کریں اہم پر دانت پیسنے سے کیا حاصل!

'اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ' اس میں پہلا ٹکڑا آخرت میں ان کے انجام کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسرا ٹکڑا اس دنیا میں ان کی روش کو۔ گویا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دین کی شاہراہ سے بعید تر ہیں اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے بدتر ٹھہریں گے۔ 'سواء' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی کسی شے کے وسط کے آتے ہیں۔ 'سبیل' سے مراد وہ صراط مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لئے کھولی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ○ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (۶۱-۶۳)

ان آیات کے تمام مشکل الفاظ پیچھے زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے لیکن یہ یہود کا وہ گروہ ہے جن کا ذکر بقرہ کی آیات ۷۶-۸۰ میں ہوا ہے وہاں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ یہود میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو مسلمانوں کی مجالس میں آتے تو کہتے کہ مومن تو ہم بھی ہیں، خدا اور رسول اور خدا کی کتاب پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ پھر مسلمان ہمیں مومن کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ یہ بات وہ اس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہتے کہ اگر ہم محمدؐ اور ان کی پیش کردہ کتاب کو نہیں مانتے تو اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے۔ آخر ہمارے پیغمبر اور ہماری کتاب بھی تو خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ عام مسلمان ان کی اس طرح کی باتوں سے دھوکے میں پڑتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں

مبتلا ہو جاتے چنانچہ اسی بنا پر قرآن نے ان کی اس بات کو 'مخادعت' سے تعبیر کیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ اگر مومن ہو تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اقرار کیوں نہیں کرتے تو اس پر برہم ہو جاتے اور کہتے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح کی حرکت نہیں کرتے۔ ہم ملک میں صلح و امن چاہتے ہیں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ مسلمان اگر کسی کو پیغمبر ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ہمارے لیے اس کا ماننا ضروری نہ قرار دیں۔ اس کو مانے بغیر ہمارا دینی مقام و مرتبہ تسلیم کریں۔ اگر مسلمان اپنے سوا سب کو غیر مومن قرار دیں گے تو اس سے ملک میں فساد برپا ہو گا جس میں سب کا نقصان ہے۔ بقرہ کی مذکورۂ بالا آیات کے تحت ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ بشترک ایمان کا یہ وہی نظریہ ہے جو وحدت ادیان کے عنوان سے تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ملک میں بھی پیش ہو چکا ہے اور اب بھی وقتاً فوقتاً اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔ زیر بحث آیات میں یہود کے اسی گروہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ جب یہ تمہاری مجالس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں، حالانکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ وہ واپس جاتے ہیں، ایمان نہ داخل ہوتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے نہ نکلتے وقت، بس تمہارے سامنے دعوے کر کے تمہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ دلوں میں ان کے جو کچھ ہے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ بقرہ کی محولہ بالا آیات میں قرآن نے ان کے دلوں کے اس بھید کو کھول بھی دیا ہے اس وجہ سے ہماری تفسیر کی روشنی میں ان آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'وتریٰ کثیرا منھم الآیہ' یہ قرآن نے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولی ہے کہ یہ ایمان کا دعوے تو کرتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ رات دن ان کی بھاگ دوڑ حق تلفی، تعدی اور حرام خوری کی راہ میں ہے۔ یہاں 'یسارعون' کا لفظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہو جانا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو بہت ہی برا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس بات کو دوسرے مقام میں یوں بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا ایمان انہی باتوں کا حکم دے رہا ہے تو بہت ہی بری باتوں کا حکم دے رہا ہے۔

'لولا ینھٰھم الربانیون الآیہ' یہ ان کے علماء اور فقہاء کو سرزنش ہے کہ آخر وہ ان برائیوں اور حرام خوریوں سے ان کو روکتے کیوں نہیں؟ اس سے علماء کے

فریضۂ منصبی کی وضاحت بھی ہو رہی ہے، اور یہود کی سوسائٹی اس وقت زوال کی جس آخری حد کو پہنچ چکی تھی اس پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ جب مریض مرض کے آخری مرحلہ میں داخل ہو جائے، اور طبیب مرض ہی کو شفا کہنے لگ جائیں تو اس مریض کی ہلاکت میں کیا شبہ رہا؟ 'قولھم الاثم' سے مراد وہ گناہ کی باتیں بھی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر گزرا اور بعض کا آگے آ رہا ہے اور وہ جھوٹی شہادت بھی ہے جس نے یہود کے اندر ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی تھی، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے گواہ بنائے گئے تھے۔ علمائے یہود کی جس اخلاقی و ایمانی موت پر یہاں ملامت فرمائی ہے، آیت کا سیاق دلیل ہے کہ ان کے اوپر یہ موت اس وجہ سے طاری ہوئی کہ وہ خود ان افعال کے مرتکب ہوتے جن میں ان کی قوم کی اکثریت مبتلا تھی۔ ایسی حالت میں ان کی زبانیں ان برائیوں کے خلاف کس طرح کھل سکتی تھیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا
بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ
مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَ
يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ ۶۴

'وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ' اوپر دین اور شعائر دین کے ساتھ ان کے مذاق کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہ اسی قسم کی ایک اور گستاخی (قول اثم) کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ــ "ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" یعنی تنگ ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۱ میں گزر چکی ہے۔ 'لقد سمع اللہ قول الذین قالوا ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء' (اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ غریب ہے اور ہم امیر ہیں) وہاں ہم نے بتایا ہے کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس دعوت کے لیے یہ موثر اسلوب اختیار کیا کہ کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟ تو یہود نے اسلام اور قرآن کی تحقیر اور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے اس دعوت کو مذاق بنا لیا کہ آجکل مسلمانوں کے اللہ میاں بہت غریب ہو رہے ہیں بندوں سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے ــ اللہ میاں غریب اور ہم بندے امیر ہیں۔ بعینہٖ اسی موقع کی بات یہاں نقل ہوئی ہے، یہود کہتے ہیں کہ ان دنوں اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہو رہا

ہے، نوبت بندوں سے قرض مانگنے تک پہنچ گئی ہے۔

'غلت ایدیہم و لعنوا بما قالوا' یہ جملہ معترضہ کے طور پر، ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود نہ تو اللہ اور اس کی سنتوں سے بے خبر تھے اور نہ دعوتِ انفاق کے اس بلیغ انداز سے۔ وہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف تھے لیکن قرآن اور پیغمبر کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے تھے کہ تحقیر و استہزا کا جو موقع بھی مل جاتا، اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور اس امر کی مطلق پروا نہ کرتے کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔

'بل یداہ مبسوطتان الایۃ' یہ ان کی بات کی تردید کے ساتھ ساتھ اس گستاخانہ رویے کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ یہ کتاب جو تمہاری طرف اتری ہے اس کے حسد نے ان کو اس طرح بے ضبط بنا دیا ہے کہ جو کچھ منہ میں آجاتا ہے وہ بک ڈالتے ہیں۔ قرآن کے سبب سے بنی اسرائیل کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض و حسد کے بھڑک اٹھنے پر تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ اور آل عمران میں بھی بحث ہو چکی ہے اور اس سورہ میں بھی بعض نہایت اہم اشارات گزرے ہیں۔ یہود اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت و سیادت بھی اب ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے۔ اس حسد نے ان کو خدا کا بھی باغی بنا دیا اور اس کے سبب سے ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور کینہ کا بیج پڑ گیا۔

'کلما اوقدوا ناراً للحرب اطفأھا اللہ' یہ مسلمانوں کو تسلی و تشفی ہے کہ اگرچہ اس عداوت اور حسد کے جوش میں یہ برابر تمہارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائیں گے لیکن اللہ ان کی کسی سعیٔ فساد کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ بلکہ جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکائیں گے خدا اس کو بجھا دیا کرے گا۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ کفار نے مسلمانوں پر جب جب بھی چڑھائی کی ہے اس میں یہود کی سازش اور انگیخت کو ضرور دخل رہا ہے۔ اس بات کی طرف ہم پیچھے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور آگے سورہ انفال میں بھی انشاء اللہ ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

'ویسعون فی الارض فساداً واللہ لا یحب المفسدین' یہ اوپر کی بات کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جو صفاتِ الٰہی کا مقتضی ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی اصل قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی اور اس کی مخالفت ہے۔ اس سے کائنات

کے تکوینی اور تشریعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے، جس سے اس زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کے سبب سے دنیا شیطان کی بازیگاہ بن جاتی ہے۔ خالقِ کائنات، جس نے یہ دنیا بنائی ہے، اس کو اس کی صلاح و فلاح مطلوب ہے۔ اس وجہ سے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک مہلت دیتا ہے جہاں تک اس کی حکمتِ ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس حد سے آگے اُن کو بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کو پسند ان لوگوں کی جد و جہد ہے جو اس دنیا میں نظامِ حق و عدل کے علمبردار ہیں، یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کی، اگر وہ حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں، مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں، ریشہ دوانیوں اور جنگ آزمائیوں کے علی الرغم ان کو برومند اور فتحیاب کرتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْکِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاَدْخَلْنٰھُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ ؕ مِنْھُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ - ۶۵-۶۶

'وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْکِتٰبِ اٰمَنُوْا'، سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہاں ایمان سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ یعنی یہ اہلِ کتاب حسد و عناد کی اس روش کے بجائے جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے، اگر ایمان و تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باغوں میں داخل کرتا۔

'ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل الایۃ' اخروی انعام کے بعد یہ اس ایمان کی دنیوی برکات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اہلِ کتاب سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی تو وہ اس سیادت و قیادت سے جو اب تک ان کو حاصل رہی ہے، محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ محض ان کی حماقت و بلادت ہے۔ اگر یہ اس کو قبول کرتے تو آسمان اور زمین دونوں کی برکتوں کے دروازے ان کے لئے کھل جاتے لیکن ان میں معقول اور راست رو تھوڑے نکلے، زیادہ فسق و بدعملی ہی میں ہیں۔

'وما انزل الیھم من ربھم' سے ظاہر ہے کہ قرآن مراد ہے۔ اس کے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے حوالے سے مقصود ایک تو یہ ظاہر

کرنا ہے کہ اس چیز کا قائم کرنا صرف اسی کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت تورات و انجیل کو بھی قائم کرنا ہے۔ اس لیے کہ تورات و انجیل دونوں کی اپنی پیشینگوئیوں کے مطابق اب یہی چیز ہے جو تورات و انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور سب کی محافظ و نگران ہے۔ دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دنیا کی متاع حقیر کے لیے، جیسا کہ اسی سورہ کی آیات ۱۲-۱۵ میں بیان ہوا ہے، اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات و انجیل کو برباد کیا اور اب اسی دنیا کی محبت انہیں اس قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے حالانکہ ان چیزوں کے قبول کرنے کے معنی اس دنیا سے محروم ہونے کے نہیں تھے، اگر یہ تورات و انجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک بنتے تو آسمان و زمین دونوں ان کیلئے اپنے خزانے اگلتے۔ سورۂ اعراف میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۹۶ (اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)

"قائم کرنے" سے مراد زندگی کے معاملات سے ان کا تعلق قائم کرنا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب اس لیے عطا فرماتا ہے کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق بسر کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو خواہ زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جائے نہ یہ کتاب الٰہی کا قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو 'قوامین بالقسط' کا درجہ حاصل ہو سکتا۔ بلکہ یہ کھلم کھلا نقض میثاق اور شریعت الٰہی کا ہدم ہے۔

منھم امۃ مقتصدۃ ۔ 'قصد' کے معنی سیدھی راہ کے ہیں 'ھو علی قصد' وہ رشد و ہدایت پر ہے۔ اس سے فلان اقتصد فی امرہ' ہے (وہ اپنے معاملہ میں راہ راست پر ہے) یہ اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کا ذکر ہے جو حالات کے اس ہمہ گیر بگاڑ کے باوجود جس کی تفصیلات اوپر گزریں، اپنے امکان کے حد تک حق پر قائم رہا اور بالآخر اسلام سے مشرف ہوا۔

"میثاق"

کے پرانے پرچوں میں سے

اس کے اولین دور زیر ادارت مولانا امین احسن اصلاحی کے پندرہ شماروں اور دورِ جدید زیر ادارت ڈاکٹر اسرار احمد کے جولائی ۶۶ تا دسمبر ۶۷ء کے ۱۸ شماروں پر مشتمل چند مجلد فائل تاحال دستیاب ہو سکتے ہیں:

ان فائلوں کے مشمولات کی فہرست مفت طلب فرمائیں

قیمت: فائل دورِ اول، غیر مجلد ۹.۰۰ روپے اور مجلد ۱۲.۰۰ روپے
فائل دورِ ثانی، مجلد ۱۰.۰۰ روپے۔ محصول ڈاک ان کے علاوہ

اس کے علاوہ

مارچ ۶۷ء سے مارچ ۱۹۶۸ء تک

تدبر قرآن : تفسیر سورۂ نساء

مکمل شائع ہوئی ہے

خوش قسمتی سے ان تمام شماروں کی ایک محدود تعداد مسلسل کے ساتھ دفتر میں موجود ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتابی صورت میں اسکی طباعت و اشاعت کا مرحلہ کب آئے۔ لہٰذا "تدبر قرآن" کے قدردان جلد از جلد ان شماروں کو حاصل فرمائیں (بعض اشاعتوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ لہٰذا تھوڑی سی تاخیر بھی محرومی کا سبب بن سکتی ہے) قیمت مع اخراجات پیکنگ و محصول ڈاک: ۱۱.۰۰ روپے۔ نوٹ: جن حضرات کے فائل نامکمل ہوں وہ جلد از جلد فی شمارہ ۵۰ پیسے کے ڈاک کے ٹکٹ ارسال کر کے پرچے طلب فرمائیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان کی فرمائش کی تعمیل ہو جائے۔ اگرچہ ہم اس کا پختہ وعدہ نہیں کر سکتے اسلئے کہ اس دور کی بعض اشاعتیں دفتر میں نہایت ہی قلیل تعداد میں ہیں اور انکے ضمن میں ہمیں مکمل فائل طلب کرنے والوں کی تعمیل کا لحاظ رکھنا ہو گا۔

مینیجر: ماہنامہ میثاق لاہور

ہ م سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا فراہیؒ

تفاسیر

دلائل النظام (عربی) سائز ۲۰×۲۶ صفحات ۱۳۲ کاغذ عمدہ سفید۔ قیمت ۵۰ء۴ روپے

مقدمہ تفسیر نظام القرآن (اُردو ترجمہ) قیمت ۹۰ء۰ پیسے

تفسیر بسم اللہ وسورہ فاتحہ	۴۵ء۰ "
" قیامہ	۶۰ء۰ "
" والشمس	۶۰ء۰ "
" فیل	۰ء۱ "
" ذاریات	۳۰ء۱ "
" مرسلات	۶۰ء۰ "
" والتین	۷۰ء۰ "
" کوثر	۱۰ء۱ "
" لہب	۷۰ء۰ "
" تحریم	۷۰ء۰ "
" عبس	۷۰ء۰ "
" والعصر	۴۰ء۰ "
" کافرون	۴۵ء۰ "
" اخلاص	۴۵ء۰ "
اقسام القرآن	۳۰ء۱ "
ذبیح کون ہے؟	۷۰ء۱ "

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

• دعوت دین اور اس کا طریق کار
صفحات ۳۱۲، قیمت ۷۵ء۳

• تزکیۂ نفس
صفحات : ۳۴۴
قیمت : -/۶ روپے

• اسلامی قانون کی تدوین
صفحات : ۱۶۰۔ قیمت -/۳ روپے
سستا ایڈیشن -/۲ "

• عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ
صفحات ۱۲۸
قیمت : ۲/۲۵ روپے

• تفسیر آیت بسم اللہ وسورہ فاتحہ
بڑا سائز
صفحات : ۳۲
قیمت : ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کرشن نگر لاہور ۱۲

افادات فراہیؒ

خالد مسعود

ہدایت وضلالت

ہدایت وضلالت کے باب میں متعدد سوالات وشبہات پائے جاتے ہیں۔ ایک عام شبہ تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ رحمت اور ہدایت کو پسند فرماتا ہے اور وہ قادر مطلق بھی ہے تو پھر اس نے تمام انسانوں کو ہدایت کیوں نہیں دے دی اور شیطان کیسے ان پر غلبہ پالیتا ہے؟ لوگوں کے مابین اس سوال کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا خدا نے ابتداء ہی سے کچھ انسانوں کو ہدایت یافتہ اور دوسروں کو گمراہ پیدا کر دیا ہے یا ابتداء میں تو سب لوگ ہدایت پر پیدا ہوئے مگر جب انہوں نے کجی اختیار کی تو خدا نے بھی ان کو گمراہ کر دیا۔ معمولی غور وفکر کے بعد عقل یہ فیصلہ دیتی ہے کہ اگر خدا نے شروع ہی سے بعض انسانوں کو گمراہ پیدا کر دیا ہے حالانکہ ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی اور وہ ان کی گمراہی پر ان کو عذاب بھی دے گا۔ تو یہ خدا کی جانب سے ایک ظلم ہے۔ لہٰذا یہ تصور خدا کے بارے میں محض ایک سوءِ ظن ہے۔ قرآن کی تعلیم بھی عقل کی اس رہنمائی کے عین مطابق ہے۔

ہدایت وضلالت کے بارے میں سنۃ اللہ

اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت کو عام رکھا ہے۔ اس نے تمام انسانوں کو ہدایت دی، ان کو سننے دیکھنے اور سمجھنے کی قوت عطا کی، انہیں حواس، احساسات، شعور، تمیز اور نیکی کی رغبت دی۔ اس نے آسمان اور زمین کو سعادت و کامیابی کی راہ دکھانے والی نشانیوں سے بھر دیا۔ اس ابتدائی ہدایت کے بعد اس نے انسانوں کو کامل ہدایت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس ذمہ داری کے ضمن میں بھی اس نے بھول جانے والے، نابالغ

بچے، مریض اور مجبور شخص پر مشقت نہیں ڈالی۔ اس طرح مکلف ہونے کے بعد جو شخص خدا کی نعمت ہدایت کا شکر گزار ہوتا ہے اور اس سے نفع اٹھاتا ہے خدا اس کو مزید ہدایت سے نوازتا ہے اور اس کی روشنی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس زیادت کا اصول وہی ہے جیسے ہم ایک دانہ بوتے ہیں تو خدا اس سے ہمیں ایک سو بلکہ سات سو دانے عطا کرتا ہے۔ ان حقائق کی شہادت قرآن مجید کی متعدد آیات سے ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (دہر ۱-۳)

ہے یہ بات کہ انسان پر ایک وقت آ چکا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا! بے شک ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا جسے ہم الٹتے پلٹتے رہے پھر ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا، اب وہ خواہ شکر گزار بنے یا ناشکرا بنے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۔

جو لوگ ہدایت کو اختیار کرتے ہیں اللہ انکی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے اور ان کو تقویٰ عطا کرتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص اس ابتدائی ہدایت سے منہ موڑتا ہے خدا اس کی تاریکی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ایسے شخص پر کفر کے نتائج مسلط ہو جاتے ہیں اور وہ خدا کے غضب میں گھر جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں، ظالموں، کافروں اور ان متکبرین کو جنہوں نے علم اور دلیل آنے کے بعد بھی حق کو ٹھکرا دیا اور خدا کی آیات کا انکار کیا، ہدایت نہیں دیتا۔ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ..... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (نحل ۱۰۴-۱۰۸)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔ اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ...... یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر رکھی ہے اور یہی غافل لوگ ہیں۔

اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ یہ لوگ جب تک خدا کی آیات کے انکار پر اڑے رہے ان پر راہ ہدایت مسدود کر دی گئی۔ دوسرے مقام کی آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (اللہ نافرمان لوگوں

کو ہدایت نہیں دیا کرتا) کا مفہوم بھی یہ ہے کہ جب تک آدمی فسق پر قائم رہتا ہے اس کو وہ کامل ہدایت نصیب نہیں ہوتی جو اطاعت پر آمادہ کرنے والی ہوتی ہے۔

ہدایت سے منہ موڑنا چونکہ آدمی کا اپنا فعل ہوتا ہے اس لئے اس کی طرف لوٹنا بھی اس کی قدرت میں ہوتا ہے۔ البتہ اگر وہ اعراض کا عادی ہو جائے اور اس سے پیچھا چھڑانا اس کے لئے مشکل ہو تو یہ اس کے دل کے مریض ہونے کی علامت ہے۔ جب تک دل مریض نہ ہو جائے اللہ تعالیٰ توبہ اور رحمت کے دروازے بند نہیں فرماتا۔ آدم کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے کلمات سیکھنا آدم کے اختیار میں تھا۔ انہوں نے توبہ کر لی تو خدا نے اسے قبول فرمایا۔ یہی معاملہ ہر شخص کا ہے۔ گناہ کے بعد ہر شخص پر توبہ کا موقع پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے قبول کر سکتا ہے ورنہ گناہ اس پر مسلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

اسی طرح تیرے رب کی بات فاسقوں پر پوری اتری ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

پس معلوم ہوا کہ ہدایت دو مرحلوں میں حاصل ہوتی ہے۔ ابتدائی ہدایت تو عام ہے لیکن کامل ہدایت کا انحصار آدمی کے اعمال پر ہے۔ خدا کی مشیت یہ نہیں کہ وہ از خود انسان کو کامل ہدایت دے کر اسے سعادت کی منزل تک پہنچا دے اور نہ یہ اس کی مشیت ہے کہ وہ انسان کو عقل و تمیز دینے کے بعد مجبور کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو یہ بات اس کے عقل کے تقاضے اور اس کی حکمت و عدل کو باطل کرنے والی ہوگی۔ پس لوگوں کی گمراہی اس سبب سے نہیں ہے کہ خدا خلق کی ہدایت پر قادر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے لئے ہدایت کو کامل نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے شکر گزار بندوں کے لئے اسے کامل کرتا ہے۔

ہدایت اللہ کا ایک احسان ہے

ہدایت اور بھلائی کی رغبت اور اس کا ارادہ فقط عقل سے نہیں حاصل ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق صرف اس شخص کو عطا کرتا ہے جو عقل کا کہنا مان کر خدا کے رستے پر چلنے لگے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ۔ (انعام ۱۱۱)

اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے ہم اکٹھی کر دیتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ الا آنکہ خدا چاہے۔ لیکن ان کی اکثریت جہل میں مبتلا ہے۔

یعنی ہدایت تو اللہ کا ایک احسان ہے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ غرور اور غفلت میں بھی مبتلا

ہیں۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نشانیوں کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معجزات کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ فرمایا:۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ (انعام ۱۱۰-۱۱۱)

وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو ایمان نہیں لائیں گے اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیں گے۔ جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

یہیں سے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی طلب اور اس کے لئے دعا کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ نماز کو اسی لئے شریعت کا پہلا حکم قرار دیا گیا کہ وہ ہدایت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سورہ انعام ہی میں آیا ہے:۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ۔ (۵۲-۵۳)

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان سے احسان کیا؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں؟

یہاں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان اسی شخص پر ہوتا ہے جو شکر گزار ہو۔ اوپر آیت انا ھدینا السبیل اما شاکراً و اما کفوراً کے حوالے سے ہم بتا چکے ہیں کہ شکر سے مراد عقل اور نور فطری کی پیروی ہے۔ نماز کی بنیاد چونکہ شکر پر ہے اس لئے یہ عبادت تکمیل ہدایت کا موجب ہے۔

ہدایت و ضلالت کا معیار

ہر چھوٹی بڑی بات کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر لوگوں کے ہدایت یا ضلالت پر ہونے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور دور اول کے مجتہدین نے بہت سے فروعی مسائل میں باہم اختلاف کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی نگاہوں میں وہ گمراہ نہیں قرار پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ سے کسی معاملے میں مشورہ لیتے اور مختلف لوگوں کی رائے متفق نہ ہو سکتی تو حضورؐ باقی رایوں کو چھوڑ کر ایک کو قبول فرماتے البتہ لوگوں کی نیت کی پاکیزگی اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ان کی کوشش کی بنا پر سب کی تعریف فرماتے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی مثال بھی ملتی ہے کہ آنحضرتؐ نے کمال رافت و شفقت سے ایک حکم دیا لیکن وحی اس کے خلاف اتر آئی کیونکہ بعض دوسرے اہم پہلو آنحضرتؐ کی نگاہوں سے مخفی رہ گئے تھے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرامؓ کی مذکورہ رایئں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام ضلالت کے شائبہ سے علیحدہ پاک تھے۔ لہٰذا ضلالت کا معیار صرف اس امر کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کی قرآن و سنت نے مذمت کی ہو اور اس کی برائی پر وعید آئی ہو۔ مثلاً شرک، فساد، خونریزی، بلا وجہ قتل، بغاوت، بے حیائی، گناہوں پر جرأت، ترک اطاعت، جماعت سے علیحدگی اور کبائر میں ملوث ہونا۔

امت مسلمہ کا اختلاف

قرآن مجید نے امت کے مابین اختلاف کی قباحت اتنی قوت سے بیان کی ہے کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ گناہ تمام گمراہی کا شیرازہ اور اللہ کا ایک غضب ہے۔ عقل بھی اختلاف کی برائیوں کو مانتی ہے۔ محبت و ہمدردی بہترین اخلاق بلکہ تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے اور اختلاف اس کا ضد ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس معاملے کو ٹھیک طرح سمجھ لیا جائے۔

اختلاف کی ایک نوعیت وہ ہے جس کے ہونے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، مثلاً ذوق، طور طریقے اور جزئیات میں آرا کا اختلاف۔ دل اس اختلاف سے باہم متنفر نہیں ہوتے جو کسی شخص کے ذاتی فعل سے متعلق ہو۔ مثلاً کھانے پینے اور لباس کا فرق۔ ہاں جب یہی ظاہری اختلاف دلوں کے اختلاف پر دلالت کرنے لگے تو نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا کسی دوسری قوم کی پوشش اختیار کر لینا۔ دلوں کے مابین دشمنی کا دوسرا بڑا سبب بعض افراد کی محبت یا دشمنی میں اختلاف کرنا ہے۔ مثلاً جیسے یہود و نصاریٰ کے مابین ہوا یا حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی خانہ جنگی یا روافض و خوارج کی چپقلش کی صورت میں اختلاف ظاہر ہوا۔ قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کے ہدایت یافتہ گروہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ مومنین کے درمیان شکر رنجی تو ہو سکتی ہے لیکن اس کو کسی ایسے قومی اختلاف کی شکل نہیں اختیار کرنی چاہیے جو امت کی اساس ہی کو منہدم کر دے۔

اختلاف جب ان امور میں ہو جو قرآن وسنت کے مطابق ہدایت وضلالت کا معیار قرار پاتے ہیں تو اس سے دو فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت یافتہ اور دوسرا گمراہ۔ ان کے علاوہ باقی امور میں اختلاف واقع ہونے سے مومنین ہی کے مختلف درجے بن جاتے ہیں جو حکمت وہدایت کے پہلو سے بلند یا پست ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص گمراہی کے کسی عقیدے میں نہ پڑ جائے۔ تفسیر آیات میں تاویل کی غلطی پر بھی اس پر گرفت نہیں کی جاتی کیونکہ ایک صاحب رائے مجتہد صحیح رائے بھی قائم کرتا ہے اور اس سے خطا بھی ہو سکتی ہے۔ ائمہ اربعہ نے فروعی معاملات میں ایک دوسرے سے دشمنی روا نہیں رکھی۔ شافعیہ اور حنفیہ کے جزوی اختلافات سے دلوں میں کوئی نفرت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ جاہل لوگوں کے ہاں یہ اختلافات اس لئے باعث نفرت بن جاتے ہیں کہ وہ ان کے اوپر جمود اختیار کر لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اہل سنت کا گروہ اہل حق کا گروہ ہے اور ہدایت پر ہونے کا ایک اہم ثبوت امت کی خیر خواہی بھی ہے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ
کرنے کا اصل کام

اسرار احمد

★ فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء ★ بنیادی نقطۂ نظر ★ عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی وفکری یورش
★ مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل ★ علوم عمرانی کا ارتقاء
★ اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں۔
★ تعبیر کی کوتاہی ★ احیائے اسلام کی شرط لازم: تجدید ایمان
★ کرنے کا اصل کام ★ عملی اقدامات ——— اور
★ — مضامین مندرجہ بالا کی تائید و توثیق بعنوان

"فکر مغرب کی اساس
اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم پروفیسر یوسف سلیم چشتی ——— سائز ۲۲ × ۱۸ ——— صفحات ۵۰۶
طباعت آفسٹ ——— قیمت: ایک روپیہ

شائع کردہ: دارالاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر لاہور، فون نمبر: ۶۹۵۲۲

مولانا عبد الغفار حسن
استاذ حدیث، مدینہ یونیورسٹی

اصلاحِ معاشرہ کی بنیادیں

—— (۳) ——

قرآن مجید داعی حق کو صرف انتقامی جذبات سے ہی پاک رہنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ حسن (اچھا) بلکہ احسن (زیادہ اچھا) طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے مخالفین دعوت سے مڈبھیڑ ہو یا ان کی بد زبانیوں اور چیرہ دستیوں کا سامنا کرنا پڑے ہر حالت میں قرآن مجید لفظ 'احسن' ہی استعمال کرتا ہے۔ ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط سورۂ نحل آیت ۱۲۵ : ۱۴	اپنے رب کے راستہ کی طرف بلاؤ حکمت اور دلنشین نصیحت کے ساتھ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے بحث کرو۔
وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ٥ سورۂ اسرائیل (آیت ۵۳)۔ ۱۵	اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ (لوگوں سے) ایسی باتیں کیا کریں جو بہت پسندیدہ ہوں کیونکہ شیطان (بری باتوں سے) ان میں فساد ڈلواتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔
وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔	اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر ایسے طریق سے جو کہ نہایت اچھا ہو۔
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	اور بری بات کے جواب میں ایسی بات

السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۝ وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ ۝ پ۱۸

سورۃ المومنین آیت (۹۶-۹۸)

کرو جو نہایت اچھی ہو اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے اور کہو اے پروردگار میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور اے پروردگار اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آموجود ہوں۔

آیت زیر درس کی طرح اس آیت میں بھی شیطانی وساوس سے بچنے کے لیے (استعاذہ) اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی قسم کا مضمون سورہ اعراف کے اخیر میں بیان ہوا ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۔ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۔

پ۹، آیت (۱۹۹-۲۰۰)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) عفو و درگزر اختیار کرو، اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں وسوسہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ طلب کرو، بے شک وہ سننے جاننے والا ہے۔

ان آیات میں دل نشین نکتہ یہ ہے کہ حسن کے بجائے احسن فرمایا ہے اس لیے کہ مخالفین دعوت کی بیجا معاندانہ سرگرمیوں اور ایذا رسانیوں کا علاج صرف اسی بلند کردار کے ساتھ ممکن ہے، اگر سیئہ (برائی) کا جواب سیئہ سے دیا گیا، تو مخالفت و عناد میں مزید اضافہ ہوگا، جیسا کہ آگ کے شعلے ایندھن کی زیادتی سے بڑھتے ہی جاتے ہیں، اس عناد، اور ہٹ دھرمی کی آگ کو بجھانے کے لیے طریقہ "حسن" کافی نہیں ہے بلکہ اس راہ میں بڑے حوصلے اور وسیع ظرف کی ضرورت ہے، اسی حکمت سے بھرپور داعیانہ کردار کو یہاں لفظ "احسن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان آیات میں ساتواں نہایت اہم وصف صبر بیان ہوا ہے۔

صبر کا مفہوم

قرآن مجید میں صبر کا لفظ حسب ذیل معانی کے لیے استعمال ہوا ہے:۔

(الف) اطاعت الٰہی پر صبر، یعنی احکام شریعت کی پابندی، مثلاً فرمایا۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۔ پ۱۶ طٰہٰ (۱۳۲)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور اس پر قائم رہو۔

(ب) مصائب اور شدائد پر صبر، مثلاً فرمایا:—

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۔

(جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا)

اسی بنا پر جزع فزع، گھبراہٹ اور بے چینی کے بالمقابل بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٍ" پ۱۳ سورہ ابراہیم آیت ۲۱۔

ہم گھبرائیں یا صبر کریں (ہمارے حق میں برابر ہے) کوئی جگہ ہمارے لئے رہائی کی نہیں ہے۔

(ج) مخالفین دعوت کی ایذا رسانیوں اور زبان درازیوں کے موقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہی صبر ہے۔ فرمایا:۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۔ پ۲۹ سورہ مزمل آیت (۱۰)

اور (جو دل آزار) باتیں یہ لوگ کہتے ہیں ان کو سہتے رہو اور اچھے طریق سے ان سے کنارہ کش رہو۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۔

اور تکلیفیں تم ہم کو دیتے ہو اس پر صبر کریں گے

وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۔ پ۲۵ سورۃ الشوریٰ آیت (۴۳)

اور جو صبر کرے اور قصور معاف کردے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

جلد بازی کے بجائے تحمل اور انتظار کی کیفیت کو بھی قرآن مجید میں صبر سے تعبیر کیا گیا ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ سورہ حجرات (۴-۵) پ۲۶

جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں اور اگر وہ صبر کئے رہتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔

(د) جنگ کے موقع پر دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ جانا بھی صبر ہی کی ایک قسم ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے،

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار

وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔
پ۲ سورہ البقرہ آیت (۱۷۷)

کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں (جو ایمان میں) سچے ہیں۔ اور یہی ہیں (جو خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔

اس آیت میں صبر کے مذکورہ بالا تمام مفہوم مراد ہو سکتے ہیں خصوصاً سیاق و سباق کے لحاظ سے نمبر "ج" اور "د" یہاں زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۔ یعنی احسن طریقہ سے بدزبانی اور بدسلوکی کا جواب وہی دے سکتے ہیں جنکو خیر و صلاحیت کے لحاظ سے اللہ تعالٰی کے ہاں سے بڑا حصہ ملا ہو، ہر شخص کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس سعادت اور خوش نصیبی سے ہمکنار ہو سکے۔

حظ عظیم سے کمال نفس، کمال عقل اور کمال خلق حسن سب ہی مراد ہو سکتے ہیں۔

(۸) وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الآیہ، دعوتِ حق کی راہ میں دو قسم کے افراد اپنی شرارت اور سرکشی کی بنا پر رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کا ذکر قرآن سے ذیل کی آیات میں ملتا ہے۔

(الف) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ اِلٰہِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ،

کہو میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی، (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو خدا کا نام سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

(ب) وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔
پ۸ سورہ الانعام آیت (۱۱۲)

اور اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا، وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں دھوکے کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

شیاطین الانس یعنی بنی آدم میں دعوتِ حق کے لیے معاندانہ رویہ رکھنے والے۔ اس قسم کے شیاطین حسن سلوک سے رام ہو سکتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں ان کا علاج بتایا گیا ہے

لیکن شیاطین الجن کی وسوسہ اندازیوں اور سیہ کاریوں سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے یعنی ان کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالٰی کی پناہ حاصل کی جائے اس استعاذہ کے بغیر امن و سلامتی ناممکن ہے۔ سورہ مومنون میں شیاطین الجن سے حفاظت میں رہنے کے لیے مخصوص دعا کی تلقین کی گئی ہے یہ آیت پہلے مع ترجمہ ذکر ہو چکی ہے، اس آیت سے داعی حق کا ایک اہم وصف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعلق باللہ کے لحاظ سے بہت ہی اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے، خصوصاً اس قسم کے نازک مواقع پر اللہ تعالٰی کی طرف پلٹنے اور اس کی پناہ حاصل کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے

اسلوب قرآنی

زیر تشریح و تفسیر آیات کے اخیر میں نزغ شیطانی (وسوسہ شیطانی) کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ "انہ ھو السمیع العلیم" بے شک وہی ہے سننے جاننے والا۔ لیکن سورۂ اعراف میں "انہ سمیع علیم" بے شک وہ سننے جاننے والا ہے، یہاں کلام میں وہ زور اور تاکید ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے جو حم السجدۃ میں پیش نظر رہی ہے، اس لیے سورہ اعراف میں برے سلوک کے مقابلہ میں زیادہ اچھے سلوک کے کرنے پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ نادانوں سے کنارہ کش رہنے اور معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن زیر تفسیر آیات میں اللہ تعالٰی کی صفات سمیع و علیم کو تاکیدی انداز میں بیان فرمایا گیا ہے اسی انداز بیان اور اسلوب کلام سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ برے سلوک کے مقابلے میں حسن سلوک بلکہ انتہائی حسن سلوک سے پیش آنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، یہ بلند مقام، اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالٰی کی صفات خصوصاً "سمیع علیم" پر قوی ایمان رکھتا ہو۔

خلاصہ کلام

حم السجدۃ کی ان آیات ان الذین قالوا ربنا اللہ سے انہ ھو السمیع العلیم" تک داعی حق کی حسب ذیل اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ان کو بیک نظر مستحضر رکھنے کے لیے دوبارہ اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

(۱) توحید کا اعلان اور اللہ تعالٰی کی ربوبیت کا اقرار و اعتراف، اس کی زندگی کا اہم مقصد ہوتا ہے۔

(۲) فوری اور وقتی جوش کے بجائے وہ استقامت و استقلال کی نعمت سے مالا مال ہوتا ہے۔

(۳) داعی حق صرف اپنے رب اور مالک کی طرف دعوت دیتا ہے، کسی شخصیت، قوم،

نسل، جماعت یا تنظیم کی طرف نہیں۔

(۴) داعیٔ حق اپنی دعوت پر پہلے خود عمل کرتا ہے۔

(۵) داعیٔ حق اپنی دعوت کا اعلان جرأت اور بے باکی سے کرتا ہے اس بارے میں کسی قسم کی شرم یا جھجک اسے محسوس نہیں ہوتی۔

(۶) داعیٔ حق اپنی دعوت کی بنا پر کسی برتری کے احساس میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔

(۷) داعیٔ حق ہر قسم کی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر "مسلم" کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

(۸) داعیٔ حق بُرے سلوک کے جواب میں بہترین سلوک سے پیش آتا ہے۔

(۹) داعیٔ حق کبھی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

(۱۰) داعیٔ حق کا تعلق اپنے رب سے انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ تلک عشرۃ کاملۃ

دعوت وتبلیغ اور اصلاح معاشرہ کی یہ اہم بنیادیں ہیں جن کو پیش نظر رکھے بغیر کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہم سے طلب فرمائیں

حقیقت خلافت و ملوکیت

تالیف: علامہ سید محمود احمد عباسی

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف

"خلافت و ملوکیت" کا مسکت جواب

مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

سائز $\frac{20 \times 36}{16}$ صفحات ۵۶۸ مجلد

قیمت قسم اول سفید کاغذ مع ڈسٹ کور ۱۱/- روپے

قسم دوم نیوز پرنٹ ۷/۵۰ روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کرشن نگر لاہور ۸

صحیح نظامِ تعلیم اور پاکستان

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
(ایم۔ اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

تعلیم صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔ صحیح تعلیم صحیح قسم کا فرد پیدا کرتی ہے اور غلط تعلیم غلط قسم کا فرد، اور تعلیم کا مقصد اس کو صحیح یا غلط کرتا ہے۔ فرض کیا ایک ڈاکو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ایک کامیاب اور ہوشیار ڈاکو بن جائے۔ اس کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کو قفل اور سیف توڑنے اور گھسانے، بندوق چلانے وقت پر بھاگنے اور چھپنے اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے اور نکل آنے کی پوری پوری نظری اور عملی تعلیم دے۔ جب وہ ان طور طریقوں کا ماہر ہو جائے گا تو وہ اپنے باپ کے نزدیک تعلیم یافتہ کہلانے کا حقدار ہوگا۔ لیکن ہمارے خیال کے مطابق اس کی تعلیم صحیح نہیں ہوگی بلکہ غلط ہوگی۔ وہ ایجوکیشن EDUCATION نہیں بلکہ مس ایجوکیشن MISEDUCATION ہوگی کیونکہ ہمارے نزدیک اس کی تعلیم کا مقصد غلط ہے۔

کوئی نظام تعلیم مقصد کے بغیر نہیں ہوتا خواہ اس کا مقصد آشکار ہو یا مخفی۔ مذکور ہو یا غیر مذکور۔ شعور میں ہو یا لاشعور میں۔ موضوع کلام بن چکا ہو یا معہود ذہنی رکھا گیا ہو اور یہ مقصد تعلیم وہی ہوتا ہے جو نظام تعلیم قائم کرنے والے کے نزدیک خود زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ زندگی کا جو مقصد بھی معلم کے ذہن میں ہوتا ہے خواہ وہ اس کا ذکر کرے یا نہ کرے وہ اس کے بپا کئے ہوئے نظامِ تعلیم کے ہر جزو پر حاوی ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ جزو نصابی کتاب ہو یا معلّم کا لیکچر یا درس یا مکتب کا عام ماحول۔ جس طرح کوئی نقش اس کاغذ یا کپڑے سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ بنایا گیا ہو۔ اسی طرح کوئی نظامِ تعلیم اس مقصد حیات سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ قائم ہو خواہ اس مقصد حیات کا ذکر نظامِ تعلیم کے اندر موجود ہو یا نہ ہو۔

چونکہ حضرتِ انسان نے مقصد زندگی کے مختلف نظریات قائم کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس کے نظام ہائے تعلیم بھی مختلف ہیں۔ دنیا میں اتنے ہی نظام ہائے تعلیم ہیں۔ جتنے مقاصد حیات یا نظریات زندگی۔ ہر ریاست کسی نظریۂ زندگی پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ریاست کا اپنا الگ نظامِ تعلیم ہوتا ہے جس کا مقصد وہی ہوتا ہے جو ریاست کا مقصد زندگی ہو۔ حکمائے تعلیم نے اس حقیقت کا اعتراف حال ہی میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فلسفۂ تعلیم کا ایک نیا شعبہ وجود میں آیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف نظام ہائے تعلیم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ہر ایک کی خصوصیتیں معلوم کی جائیں۔ اس شعبۂ علم کو تقابلی تعلیم (COMPARATIVE EDUCATION)

کا نام دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا ہر مقصد جو انسان کے ذہن میں آئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ صحیح مقصدِ تعلیم جو صحیح نظامِ تعلیم کو پیدا کرنے والا ہو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس ایک مقصدِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے علاوہ باقی تمام مقاصدِ تعلیم اور نظام ہائے تعلیم کم و بیش غلط اور بے ہودہ اور بے کار ہوں۔ جس نسبت سے کسی نظامِ تعلیم کا مقصد صحیح مقصدِ تعلیم سے ہٹا ہوا ہو گا اسی نسبت سے وہ نظامِ تعلیم غلط تعلیم یا مس ایجوکیشن (MISEDUCATION) کا باعث ہو گا اور غلط قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ اگر اس کا مقصد مکمل طور پر صحیح ہو گا تو وہ نظامِ تعلیم مکمل طور پر صحیح ہو گا۔ اور صحیح قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم مختلف قسم کے نظام ہائے تعلیم کے مقاصد اور ان کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے باوجود اس بات پر کوئی تحقیق کام نہیں کر سکے کہ صحیح مقصدِ تعلیم جو صحیح قسم کے نظامِ تعلیم کو پیدا کرتا ہو کیا ہے اور کس طرح سے جانچا یا پرکھا جا سکتا ہے کہ واقعی صحیح ہے اور اس کا علمی اور عقلی محک و معیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تحقیقی کام ایسے حقائق کو سامنے لاتا ہے جو ان کے لادینی نقطۂ نظر کے منافی ہیں اور جن کا سامنا کرنے سے ان کو اس لئے بھی گریز ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تحقیق کرنے والے کا خود اپنا قومی نظامِ تعلیم غلط مقصدِ تعلیم اور غلط مقصدِ حیات پر مبنی ہے اور لہٰذا غلط ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد تحقیق کرنے والا اپنی قوم کا پسندیدہ اور ہردلعزیز فرد نہیں رہ سکتا۔ اور پہلی مثال میں وہ کو خود کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کی تعلیم غلط ہے۔ بلکہ وہ اس کی صحت اور معقولیت اور ضرورت کے حق میں دلائل مہیا کرے گا۔ تاہم جو معلم افراد کی صحیح تعلیم کا اہتمام کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے حد درجہ ضروری ہے کہ وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ صحیح مقصدِ تعلیم کیا ہے۔

آج تمام حکمائے تعلیم اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنا پر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تعلیم انسان کی اندرونی اور قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے جو خود بخود اپنے مراحل طے کرتا جاتا ہے بشرطیکہ گرد و پیش کے حالات اس نشوونما کے ممد و معاون ہوں مزاحم اور مخالف نہ ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک حیوان یا پودے کی نشوونما جب ایک پودا یا حیوان نشوونما پاتا ہے تو کوئی چیز باہر سے اس پر تھوپی نہیں جاتی بلکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر بالقوۃ موجود ہوتی ہیں وہی نشوونما پانے سے بالفعل آشکار اور نمودار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بشرطیکہ بیرونی حالات مثلاً ہوا پانی روشنی اور خوراک اس پودے یا حیوان کی نشوونما کے لئے سازگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح طریق تعلیم یہ ہے کہ بچے کی اندرونی قدرتی نشوونما کے عمل میں کوئی مداخلت نہ کی جائے اور اس کو خود اپنی راہ پانے کے لئے آزاد رہنے دیا جائے معلم کا کام صرف اتنا ہو کہ وہ بچے کے ارد گرد ایسے حالات پیدا کر دے جو اس کی نشوونما کے اندرونی مخفی تقاضوں سے

پوری پوری موافقت رکھتے ہوں اور ایسے حالات کو بچے کے ماحول سے باز رکھے۔ جو ان تقاضوں کے منافی ہوں

عملِ تعلیم کی اس بنیادی عظیم الشان اور مسلّم حقیقت سے کئی قیمتی نتائج برآمد ہوتے ہیں مثلاً اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ انسان کے پاس اس کے جسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ایسی ہے جو نشوونما پا سکتی ہے اور پاتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تعلیم جسم کی نشوونما کا نام نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ناتعلیم یافتہ آدمی کا جسم پوری طرح سے نشوونما پایا ہوا ہو اور ایک عمدہ اور اعلیٰ تعلیم کے آدمی کا جسم نحیف و نزار ہو۔ اگر انسان کا جسم ہوا، پانی، روشنی اور غذا سے نشوونما پاتا ہے تو نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز تعلیم سے نشوونما پاتی ہے۔ لہٰذا ماہرِ تعلیم کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وجودِ انسانی کے اندر یہ دوسری چیز جس کی نشوونما کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ کونسی ہے اور کیسی ہے۔ اس کے اوصاف و خواص کیا ہیں۔ اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی ضرورتیں کیا ہیں۔ کونسی چیزیں اس کی نشوونما کے لئے ممد و معاون ہیں۔ اور کونسی مضر اور مخالف جب تک ماہرِ تعلیم اس چیز کی ضروریات کو نہ جانے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تعلیم پا لینے گی اور نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز وہی ہے جسے فلسفہ کی اصطلاح میں شخصیت اور مذہب کی اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے"

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

دوسرا نتیجہ اس عظیم الشان عملی حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ جس طرح سے آم کی ایک گٹھلی کی نشوونما کا یہ صحیح مقصد کہ اسے نشوونما پا کر ایک خاص قسم کا درخت بننا چاہئے۔ جس کی چھال، پھل، پھول، پتے اور ٹہنیاں خاص قسم کی ہوں۔ گٹھلی کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے اسی طرح سے شخصیتِ انسانی کی نشوونما کا صحیح مقصد جو اس کی صحیح اور کامل نشوونما کا ضامن ہے اس کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے اور ہم ڈیوی اور اس کے ہم خیال مغربی حکمائے تعلیم نے غلطی سے سمجھا ہے۔ اسے انسان کے خارجی حالات و واقعات اور بیرونی ضروریات میں تلاش نہیں کر سکتے۔ ان حالات و واقعات اور ضروریات کے خلاف انسان کا صحیح ردعمل وہی ہونا چاہئے جو انسانی شخصیت کے صحیح اندرونی فطرتی مقصدِ تعلیم کے مطابق نشوونما پائی ہوئی ایک انسانی شخصیت سے سرزد ہوتا ہے۔ اگر انسانی شخصیت کی نشوونما اس کے اندرونی فطری مقصدِ تعلیم کے مطابق ہوئی ہو تو انسانی شخصیت آزادانہ اور مکمل طور پر نشوونما پاتی ہے اور نشوونما پا کر خود بخود نظریاتی، علمیاتی، اخلاقیاتی اور جمالیاتی خصوصیتوں کے ایسے پھل پھول پتے اور ٹہنیاں پیدا کر لیتی ہے۔ جو خالصتہً انسانی قسم کے ہوں اور مقامِ انسانی کے شایانِ شان ہوں۔

تیسرا نتیجہ: اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ روحِ انسانی یا شخصیتِ انسانی کو اپنی نشوونما کیلئے کسی غذا کی ضرورت ہے کیونکہ نشوونما بغیر غذا کے تصور میں نہیں آ سکتی۔ وہ غذا کونسی ہے جو روح کی پرورش

یا دوسرے لفظوں میں انسان کی تعلیمی نشوونما کا باعث ہوتی ہے۔ اس سوال کا معقول جواب جس کی طرف صحیح علمی و عقلی استدلال رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ہے کہ روح کی غذا حسن ہے۔ جس طرح جسم کو غذا کی اشتہا ہوتی ہے اسی طرح روح کو حُسن کی اشتہا ہوتی ہے اور جس طرح جسم غذا سے لذت اندوز ہوتا ہے اور تازگی اور شگفتگی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح روح حسن سے لذت اندوز ہوتی، اطمینان پاتی اور سرور حاصل کرتی ہے۔ پھر جس طرح جسم کے اندر غذا کو جذب کرنے اور جذب کرکے قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے۔ اسی طرح روح انسانی میں حسن کو جذب کرنے اور جذب کرکے اخلاقی، علمی، روحانی اور جمالیاتی طور پر قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے جس طرح جسم کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایسی خوراک کی جستجو کرتا ہے جو پاک اور صاف اور لذیذ اور صحت بخش ہو اور جس کے اندر پروٹین اور حیاتین اور نمکیات کے تمام ضروری عناصر موجود ہوں اسی طرح حسن کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایک ایسے تصور کی جستجو کرتا ہے جو نہایت ہی حسین اور جمیل ہو جس سے زیادہ حسین اور جمیل تصور اور کوئی نہ ہو۔ جو ہر نقص اور کمی سے مبرا ہو اور جس کے اندر بلا استثنیٰ تمام صفات حسن و کمال بدرجہ موجود ہوں صرف ایسا تصور ہی انسان کی اشتہائے حسن کو پوری طرح سے مطمئن کر سکتا ہے۔ لفظ خدا کی تعریف ہی سے ظاہر ہے کہ ایسا تصور سوائے خدا کے تصور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ جو ذات تمام نقائص سے مبرا اور تمام صفات حسن و کمال سے متصف ہو اسی کو خدا کہا جاتا ہے۔ لہذا انسان فطرتاً خدا اور اس کی صفات حسن کی اشتہا یا آرزو رکھتا ہے اور اس آرزو کو مطمئن کرنے اور حسن کو اپنی شخصیت کے اندر جذب کرنے کے لئے حسن کی تلاش کرتا ہے اور اس غرض کے لئے ہر مفید اور کارآمد طریق جس کی راہنمائی پاتا ہے۔ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً خدا کی صفاتِ حُسن پر توجہ مرکوز کرکے حسن کے باطنی مشاہدہ سے لذت اندوز ہونے کے لئے ان الفاظ کو بار بار دہراتا ہے جو ان صفات پر دلالت کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور حسن سے انتہائی قرب حاصل کرنے اور ہر ایسی خواہش سے چھٹکارا پانے کے لئے جو اسی قرب میں حائل ہونے والی ہو۔ وہ قیام اور رکوع اور سجود اور قعود کے ذریعہ سے حسن کے سامنے عاجزی اور انکساری اور تضرع اور ابتہال اور گریہ زاری کرتا ہے۔ آرزوئے حُسن کو مطمئن کرنے کا یہ طریق جس کی ایک صورت نماز بھی ہے ذکر کہلاتا ہے۔ پھر وہ علمی صداقتوں اور حقیقتوں میں خدا کی صفتِ حق کی جھلک دیکھ کر ان کی جستجو کے درپے ہوتا ہے۔ طلب حُسن کے اس طریق کو جستجوئے صداقت یا جستجوئے علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ خدا کی تخلیق میں خدا کی صفاتِ حسن کے نشانات کی جستجو کرنے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کا یہ طریق جسے تفکر یا زیادہ تفصیل کے ساتھ تفکر فی الخلق کہا جاتا ہے۔ طلب حسن ہی کا ایک پہلو ہے۔ جس کی بدولت مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر وہ اپنے ان اعمال و

افعال میں جو اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ اس کے برتاؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔ باطنی اور معنوی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی ان کو بمصداق تخلقوا باخلاق اللہ خدا کی صفات حسن کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرزوئے حُسن کو مطمئن کرنے کے اس طریق کو حسنِ اخلاق یا نیکی کی جستجو کا نام دیا جاتا ہے پھر وہ اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، اوڑھنے پہننے اور بننے سنورنے، کھانے پینے، بات چیت کرنے، کھیلنے سفر کرنے اور دوسروں سے میل ملاقات کرنے اور ان کے علاوہ اپنے دوسرے کاموں کے طور طریقوں میں ظاہری حسن اور صفائی اور عمدگی اور زیبائی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے بحکم اللہ جمیل و یحب الجمال آرزوئے حسن کی تشفی کے اس طریق کو جس کا مقصد عملی زندگی میں تخلیق حسن ہے جمالیاتی فعلیت AESTHATIC ACTIVITY) کہا جاتا ہے۔ حسن کی آرزو کو مطمئن کرنے کے یہ چاروں طریقے یعنی عبادت یا تلاش حسن، تحصیل علم یا جستجوئے حُسن، نیکی یا حسن خلق، جمالیاتی عمل یا حسنِ ذوق شخصیت انسانی کی تکمیل اور تجمیل کا یا دوسرے لفظوں میں اس کی بالیدگی اور نشوونما کا موجب ہوتے ہیں۔

<u>چوتھا نتیجہ</u> اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ چونکہ تعلیم ایک اندرونی اور قدرتی عمل ہے۔ لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ قدرت نے اس کو کلیتہً انسان پر چھوڑ دیا ہو بلکہ ضروری ہے کہ اس نے اس کے بنیادی لوازمات کا اہتمام خود کیا ہو قدرت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی ہر ضرورت کا بنیادی اور ضروری اہتمام خود کرتی ہے اور پھر یہ اہتمام اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کو نظرانداز کرکے یا اس سے پہلو تہی کرکے اس ضرورت کو تمام و کمال پورا کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک حیوان کی بدنی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے۔ قدرت اس کا بنیادی اہتمام دو طرح سے کرتی ہے ایک تو یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے اندر غذا جذب کرنے اور غذا کو جذب کرکے نشوونما پانے کی اندرونی صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے باہر ہوا اور غذا اور پانی اور روشنی ایسی چیزیں مہیا کی ہیں جن کے بغیر اس کی یہ اندرونی صلاحیتیں بے کار ہوتیں کیونکہ ان کا مہیا کرنا حیوان کے بس کی بات نہ تھی۔ بالکل اسی طرح سے روح انسانی کی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے اور قدرت نے اس نشوونما کا بنیادی اہتمام دو طرح کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے شخصیت انسانی سے باہر پے درپے آنے والے معلموں کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جن کو انبیا کہا جاتا ہے اور پھر اس سلسلہ کو اس نے ایک معلم کامل (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ختم کیا ہے جو نہ صرف اپنی زبانی تلقین اور ہدایت سے بلکہ اپنی عملی زندگی کے نمونہ سے بھی انبیاء کی تعلیم کو کمال پر پہنچاتے ہیں۔ خاتم النبیین کے ظہور کے بغیر نہ توحید کا تصور ہی ان غلطیوں اور شرک کی آلائشوں سے پاک و صاف ہو سکتا تھا جو اس میں داخل ہو گئی تھیں اور نہ ہی خدا کے پاک اور صاف عقیدہ کے مطابق عملی زندگی بسر کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہی سامنے آسکتا تھا جس میں خدا کا پاک و

صاف عقیدہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں کیا ہوا نظر آتا۔ نظری اور عملی طور پر خدا کے عقیدہ کے معنی کیا ہیں، اس سوال کا مکمل جواب ہمیں صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی سے مل سکتا ہے۔

مختصر طور پر صحیح تعلیم کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا ہر عنصر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہو۔ خدا کا عقیدہ ہی اس کے علمی، اخلاقی، سائنسی اور جمالیاتی پہلوؤں کی بنیاد ہو۔ تعلیم کا جو پہلو بھی خدا کے عقیدہ کے بغیر رہے گا، وہ روحِ انسانی کے شدید جذبِ حسن کا انجام نہیں کر سکے گا اور لہٰذا فرد کی تعلیمی نشوونما کے لئے بے کار ہوگا چونکہ سارے حسن کا منبع خدا ہے اور علم اور اخلاق اور عبادت اور جمالیاتی عمل کا مقصد حسن کی جستجو ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انسان کی علمی، اخلاقی، جمالیاتی اور سائنسی فعلیت اپنے مقصد کو اس وقت پائے گی اور اپنے کمال کو اس وقت پہنچے گی جب اس کا مطلوب اور مقصود اور اس کا مدار اور محور خدا ہوگا۔ ہمارے علمی، اخلاقی، سائنسی اور جمالیاتی اعمال جس قدر خدا کے تصور سے ہٹے ہوئے ہوں گے وہ اس قدر غلط اور ناقص ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ معلمِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارے تمام سائنسی، اخلاقی، علمی اور جمالیاتی اعمال افعال کا مقصود خدا ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے عقیدہ سے ہٹ کر اگر کوئی تعلیم ممکن ہے تو وہ کم و بیش ایسی ہی ہو سکتی ہے جیسی کہ اردو کی مثال میں راہزن کے بیٹے کی تعلیم۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ بے خدا تعلیم کی بعض قسمیں بڑے اور آشکار راہزن پیدا کرتی ہیں اور بعض قسمیں چھوٹے اور مخفی راہزن۔

جسم کی اشتہائے غذا کی طرح روح کی اشتہائے حسن بھی پوری طرح سے دبائی نہیں جا سکتی۔ اگر انسان کو اچھی لذیذ اور صحت بخش غذا نہ مل سکے تو پھر جو غذا بھی اسے مل جائے وہ اسی سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ اور اسی میں لذت محسوس کرتا ہے خواہ اس کی صحت ٹھیک رہے یا نہ رہے۔ اسی طرح سے جب انسان اپنی لاعلمی یا اپنے تعصب کی وجہ سے خدا کے تصور سے پوری طرح آشنا نہ ہو اور خدا کی صفات کے حسن و کمال کا ذاتی احساس نہ کر سکے تو وہ اپنی اشتہائے حسن کی تشفی کے لئے کسی غلط اور ناقص تصور کی طرف لاشعوری طور پر خدا کی صفاتِ حسن کو منسوب کرنے لگتا ہے۔ اور اسی کو اپنی مشتاقِ جمال فطرت سے مجبور ہو کر اس طرح سے چاہنے لگتا ہے کہ گویا وہ سچ مچ کا خدا ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو وہ پھر تمام علمی یا سائنسی حقائق جو اس کے دائرہ علم میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے تمام قدرتی، اخلاقی اور جمالیاتی اور سائنسی اعمال و افعال جو اس سے سرزد ہوتے ہیں اس کے اس تصورِ حسن میں ڈوب کر اور اس کے رنگ سے رنگین ہو کر باہر آتے ہیں، اور اس عمل کے دوران میں اپنی قدرتی حالت سے بدل کر اس کے مطابق ہو جاتے ہیں، اور لہٰذا اتنے ہی غلط اور ناقص ہو جاتے ہیں جتنا کہ اس کا یہ تصورِ حسن غلط یا ناقص ہوتا ہے۔

اس کے علمی حقائق اس کے تصورِ حسن کے ساتھ مل کر ایک تنظیم بناتے ہیں اور اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ مقناطیس کے ارد گرد لوہے چون کے اجزا۔

دورِ حاضر کے غلط اور ناقص تصوراتِ حسن جو اس طرح سے خدا کی جگہ لیتے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:- انگریزی قومیت، فرانسیسی قومیت، اطالوی قومیت، جرمن نسلیت، یہودی نسلیت، عربی نسلیت، روسی اشتراکیت، امریکی جمہوریت وغیرہ۔ یہی آج کل قوموں کے مقاصدِ حیات ہیں اور یہی ان کے مقاصدِ تعلیم۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے کہیں بھی نہیں۔ اس وقت عالمِ انسانی میں کوئی بھی نظامِ تعلیم ایسا نہیں جو تعلیم کو ایک اندرونی نشوونما کے عمل کی حیثیت سے اپنا صحیح اور قدرتی راستہ اختیار کرنے کے لئے آزاد چھوڑتا ہو۔ بلکہ جس طرح سے آم کا نوخیز پودا ایک طرف دباؤ پڑنے سے اُگنے کے باوجود ٹیڑھا ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جھک کر زمین سے لگ جاتا ہے اسی طرح سے اس وقت دنیا کے ہر نظامِ تعلیم کے اندر کسی نہ کسی غلط اور ناقص مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم کا دباؤ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصیتوں کو ٹیڑھا کر رہا ہے یہاں تک کہ اب ٹیڑھی اور غیر قدرتی نشوونما پانے والی شخصیتوں نے عالمِ انسانی کو بھر دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ لاکھوں افراد ذہنی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا کے دماغی ہسپتالوں کو بھر رہے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ طفولیتی بے راہ روی (DELIQUENCY) کی حدود ہر روز پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ خودکشیوں، ڈکیتیوں، قتلوں اور دوسرے جرموں کے اعداد و شمار بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ امریکہ کی مخلوط یونیورسٹیوں میں آزادانہ جنسی میل جول کی خطرناک تحریکیں اربابِ اختیار کی چشم پوشی سے ہی نہیں بلکہ سرپرستی میں کھلم کھلا منظم کی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت عالمِ انسانی ہر لمحہ ایک عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں کا خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اقتصادی خوشحالی کے باوجود مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں کے دل بے قرار اور زندگی سے بیزار ہیں۔ اس وقت نوعِ انسانی کی سب سے بڑی بدبختی ایٹم بموں اور میزائیلوں کے جابجا پھیلے ہوئے انبار نہیں بلکہ غلط اور بے خدا تعلیم کی عالمگیری ہے جس سے انسان کی اور تمام بدبختیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارا پاکستانی نظامِ تعلیم بھی جس کو ہم نے اسلامیات کا ایک مضمون شامل کر کے صحیح بنانے کی کوشش کی ہے، مغرب کے بے خدا اور غلط نظام ہائے تعلیم کی ایک بھونڈی نقل ہے۔ اسلامیات کا مضمون شامل کرنے سے اس کے اساسی لادینی مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ پاکستانی طالبِ علم کے ذہن میں یہ بات اور واضح ہو گئی ہے کہ یونیورسٹی کے اصل علوم

کے ساتھ جو پورے نصاب کا پچانوے فی صد حصہ ہیں۔ اسلام یا اسلامیات کا کوئی تعلق نہیں گویا اس وقت پاکستانی نظامِ تعلیم دو نظریاتِ تعلیم کے زیرِ اثر ہے ایک صحیح اور باخدا نظریہ تعلیم جو اسلامیات کے مضمون کی حد تک کام کرتا ہے اور دوسرا غلط اور لادینی نظریۂ تعلیم جو باقی ماندہ پورے نظامِ تعلیم پر چھایا ہوا ہے۔

لیکن حق و باطل کا امتزاج باطل ہی بن جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا لاتلبسوا الحق بالباطل اقبال نے اس آیت کا ایک شعر میں ترجمہ کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

بڑی مدت کے بعد اہلِ مکہ نے یہ بات سمجھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ بتوں کی عبادت گوارا کیوں نہیں کر سکتے۔ حق و باطل اور نور و ظلمت بہم نہیں ہو سکتے۔

اگر نوعِ انسانی نے زندہ رہنا ہے اور پھر اگر اس نے امن و اتحاد کی نعمتوں سے ہمکنار ہونا ہے اگر اس نے اپنی علمی، اخلاقی، جمالیاتی، روحانی اور مادی ترقیوں کی اس انتہا تک پہنچنا ہے جو اس کی فطرت کی صلاحیتوں کے اندر اس کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو اس بے خدا اور غلط تعلیم کا طلسم ٹوٹنا چاہئے۔ لیکن مغرب جو اس طلسم کا خالق ہے اس کو توڑ نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم خدا کے عقیدہ کے خلاف ایک شدید قسم کے علمی تعصب میں مبتلا ہیں اسی تعصب کی وجہ سے وہ خدا کے عقیدہ کو دنیوی اور عقلی علوم کے منافی سمجھتے ہیں اور ان کا یہ دستور بن گیا ہے کہ جب بھی ان کا علمی اور عقلی استدلال خود بخود اور بے ساختہ خدا کے تصور کی طرف جانے لگتا ہے۔ وہ تکلف اس کو گھما کر واپس لاتے ہیں۔ خواہ ان کا استدلال مضحکہ خیز کیوں نہ بن جائے۔ اسی تعصب کی وجہ سے مغرب کے حکمائے تعلیم اپنی ہی دریافت کی ہوئی اس عظیم الشان علمی حقیقت سے کہ تعلیم قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے اور بیان کئے ہوئے نتائج کو جو ظاہر اور باہر ہیں اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغرب کا ہر فلسفۂ تعلیم پراگندہ خیالات کا ایک مجموعہ اور علمی اور عقلی اور منطقی استدلال کی سنگین غلطیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

پاکستانی نظامِ تعلیم کی موجودہ حالت کے باوجود اگر یہ طلسم کسی خطۂ ارض میں ٹوٹ سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے کیونکہ فقط پاکستانی قوم ہی کا نظریۂ حیات یعنی اسلام وہ روشنی بخشتا ہے جو اس بے خدا تعلیم کی علمی خامیوں اور عملی تباہ کاریوں کو آشکار کر سکتی ہے اور یہ صحیح باخدا محافظ و معاونِ انسانیت نظامِ تعلیم کو وجود میں لا سکتی ہے۔ مسلمان ممالک اور بھی ہیں لیکن اس دور میں صرف پاکستانی قوم ہی ایک ایسی قوم ہے جس نے بے شمار قربانیاں دے کر فقط اس لئے آزادی حاصل کی ہے کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں بلکہ کائنات کی آخری منزل کی طرف حرکتِ ارتقا کا ایک ضروری

قدم ہے جس کا وقت پہنچ گیا تھا۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کا قانون ہے کہ جب باطل قوت پکڑتا ہے تو ہم حق کو اس کے مقابل پر کھڑا کر دیتے ہیں کہ اس کا سر کچل دے اور اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق اب تاریخ گواہ ہے کہ ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک باطل کبھی اتنا طاقتور ہوا تھا جتنا کہ آج ہے۔ لادینیت پسندوں اور دہریت پرستوں کی بڑی بڑی سلطنتوں سے پوری دنیا بھری ہوئی ہے جن کی اقتصادی اور فوجی قوت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر خدا کا قانون سچا ہے تو اور کونسا وقت ہے جب حق باطل کے مقابل پر آنے کے لئے ابھرے گا۔ یقیناً پاکستان کا قیام باطل کے مقابل میں حق کا پہلا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ جنگ میں پانچ گنا طاقت سے حملہ کرنے والا دشمن اپنی پوری کوششوں کے باوجود پاکستان کی اتنی لمبی سرحد پر کہیں بھی پاکستان کی ڈیفینس لائن میں دراڑ پیدا نہیں کر سکا واقعات بتا رہے ہیں کہ پاکستان اس لئے وجود میں آیا ہے کہ صحیح باخدا نظامِ تعلیم یہاں سے ابھرے اور غلط اور بے خدا تعلیم کو ہر جگہ ملیامیٹ کرتا ہوا دنیا بھر میں پھیل جائے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ظہور دورِ حاضر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی تاریخ کا اس سے بھی بڑا واقعہ یہ ہوگا کہ پاکستان کے اندر ایک جدید اسلامی یونیورسٹی کی صورت میں صحیح اور باخدا نظامِ تعلیم کا ایک نمونہ یا ماڈل ظہور پذیر ہو جو اپنی معقولیت اور افادیت کی وجہ سے پہلے پورے پاکستان میں اور پھر پوری دنیا میں نقل کیا جائے۔ جو لوگ اس ماڈل کی تخلیق اور تکمیل میں اعانت کریں گے۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم خدا کی حیرت انگیز اعانت ان کے ساتھ ہوگی۔

اقتصادی وسائل اور تباہ کن آلاتِ حرب و ضرب سے دوسری قوموں پر غالب آنے کا دور گذر چکا ہے۔ اب نظریات اور تصورات کا زمانہ ہے۔ اب وہی قوم دنیا میں غالب رہے گی جس کے پاس دلوں کو مسخر کرنے والے افکار و تصورات ہوں۔ تمام دوسری قوموں کے اقتصادی وسائل اور آلاتِ حرب و ضرب اسی قوم کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی کے کام آئیں گے۔ اس قسم کے تمام افکار و تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے اور جب سائنسی علوم یعنی طبیعاتی، جمالیاتی اور انسانی علوم کو موحد بنایا جائے اور خدا کے عقیدہ کو ان کی ابتدا اور انتہا قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تمام افکار و تصورات اس سرچشمے سے بہہ نکلتے ہیں اور ان کے اندر ایک ایسی تنظیم اور ہم آہنگی اور معقولیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ منکرینِ توحید کے دلوں کو بھی متاثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا۔ ؏

تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے — ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ

اگر مسلمان قوم کا یہ رول پاکستان کے ذریعہ سے اس طرح ادا ہونے والا ہے کہ پاکستان میں

ہی صحیح اور باخدا نظامِ تعلیم کا وہ نمونہ پیدا ہوگا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا میں اپنا لیا جائے گا تو آئیے آج سے ہم مل کر اس نمونہ کو پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ اسلام کی آخری عالمگیر نشر و اشاعت کی ابتداء کرنے کی سعادت ہمارے حصہ میں آئے ۔

جماعتِ اسلامی

★ کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی ؟
★ آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے ؟
★ قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا ؟ اور
★ اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد - ایم اے - ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی ساہیوال

• ضخامت ۲۳۶ صفحات • سائز بڑا • طباعت آفسٹ
• مجلّد مع گرد پوش • قیمت ۴/- روپے
علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ

اصرت دوڈ۔ کرشن نگر، لاہور ۱۲

تاریخِ تصوفِ اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مقدمہ

تاریخِ اسلام میں صوفیائے کرام کا مقام

(ان کے تبلیغی کارنامے اور دینی خدمات)

تاریخِ اسلام میں صوفیائے حق نے جو شاندار علمی، دینی اور تبلیغی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ اس قدر طویل الذیل ہیں کہ ان کی تفصیل کے لئے جداگانہ تصنیف درکار ہے۔ اس لئے اس فصل میں ان کی طرف صرف اجمالی اشارات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) صوفیائے کرام کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو قیل و قال کے بجائے اپنے عمل سے مبرہن کیا۔ ان کی پاکیزہ زندگیاں اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا خلاصہ تین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ محبتِ الٰہی، مکارمِ اخلاق اور خدمتِ خلق۔ روحِ اسلام کے ان اجزائے ثلاثہ میں منطقی ربط یہ ہے :-

(۲) صوفی کی زندگی کا آغاز اور انجام یعنی محور۔ محبتِ الٰہی ہے۔ اس کی نظر میں اللہ صرف معبود ہی نہیں ہے بلکہ مقصود بھی ہے مطلوب بھی ہے اور محبوب بھی ہے۔ وہ اللہ ہی کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے مرتا ہے۔ اس کا جینا اور مرنا یعنی ساری زندگی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ اس آیت کی زندہ تصویر ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ میری نمازیں اور میری رسوم دینی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے۔ جو ساری کائنات کا خالق اور پروردگار ہے۔

اب ۱ چونکہ صوفی کا مطمحِ نظر اور نصب العین اللہ ہو جاتا ہے اس لئے وہ ہر وقت اس کی خوشنودی یا رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ فاسقوں اور فاجروں، ظالموں اور باغیوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اس لئے وہ تمام منکرات و فحشاء سے مجتنب رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رذائل اخلاق کا ازالہ ہو کر اس میں مکارم اخلاق پیدا ہو جاتے۔ مرشد رومی نے اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے :-

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

یعنی عشق وہ بھٹی ہے جس میں پڑ کر صوفی کندن ہو کر نکلتا ہے۔

(ج) جب عشق کی بدولت اس میں مکارم اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں تو لا محالہ اس کا وجود بنی آدم کے حق میں سراپا رحمت بن جاتا ہے اور وہ صحیح معنی میں ان کی خدمت کا اہل ہو جاتا ہے۔

اب ہم ان ارکان سہ گانہ کو صوفیوں کی زندگی سے واضح کریں گے۔

(۱) **محبت الٰہی**

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رح ایک خط میں اپنے مرید شیخ فخر الدین رح کو لکھتے ہیں کہ "اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس باب میں اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش سے اہم مطلوب اور اعظم مقصود، رب العالمین کی محبت ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے محبت الٰہی کو اپنی زندگی کا اصلی مقصد قرار دے لیا تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رح اکثر اوقات میں یہ رباعی نہایت سوز و گداز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے :-

دنیا ستہ ما و قیصر و خاقاں را　　دوزخ بد را، بہشت مر نیکاں را
تسبیح فرشتہ را، صفا انساں را　　جاناں مارا و جان ما، جاناں را

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے اپنے مرشد حضرت بابا فرید رح کو دیکھا کہ اپنے حجرے میں پشت پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑے ہیں سجدے کی طرف چند قدم بڑھتے ہیں اور یہ رباعی پڑھ کر وجد کر رہے ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم　　خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصودِ من بندہ ز کونین توئی　　از بہر تو میرم و برائے تو زیم

یعنی اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تو ہی میرا مقصود ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تیرے ہی لئے زندہ رہوں اور تیرے ہی لئے مروں۔

واضح ہو کہ جب ایک شخص اللہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو جاتا ہے۔ پھر ہر کام میں اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ وہ کھانا کھاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اسے لذت حاصل ہو یا اس کا جسم تنومند و توانا ہو بلکہ اس لئے کہ وہ اس کا ذکر کر سکے کیا خوب کہا ہے شیخ سعدی رح نے :-

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو در گماں کہ زیستن از بہر خوردن است

جب صوفی اس نہج سے زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو اس کا ہر قول اور ہر فعل عبادت بن جاتا ہے۔ اس کی تجارت میں مشغولیت بھی عبادت بن جاتی ہے کیونکہ عین خرید و فروخت کے وقت بھی وہ اپنے اللہ کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ وہ تجارت اس لئے نہیں کرتا کہ دولت جمع کرے بلکہ اس لئے کہ جو نفع ہو اسے راہِ خدا میں خرچ کرے یہ آیت انہی خاصان خدا کی شان میں آئی ہے :-

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۴-۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی

اس نیت سے اگر لاکھوں کروڑوں روپیہ بھی جمع کیا جائے تو وہ اکتناز[1] کے حکم میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ

یعنی اگر دولت دینی کاموں میں صرف کرنے کی نیت سے جمع کی جائے۔ تو وہ مال صالح ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال لکھتے ہیں :-

گر نداری اندریں حکمت نظر　　تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر
از تہی دستاں کشادِ اُمتاں　　از چنیں منعم، فسادِ امتاں

محبت الٰہی کا انسان پر پہلا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ موحدِ کامل بن جاتا ہے۔ دوسرا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ میں خدا کے سامنے ہوں اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ شیخ علی ہجویری لکھتے ہیں :-

"جب بندہ از روئے یقین اس بات کو جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے تو وہ ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس سے اس کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے"

تیسرا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس شخص (عاشق) کی نگاہ میں پتھر اور سونا دونوں برابر ہو جاتے ہیں بلکہ اس

[1] قرآن مجید کی اصطلاح میں اکتناز کا مطلب ہے دولت اس نیت سے جمع کرنا کہ اس کو دنیاوی شہرت یا اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ مثلاً ووٹوں کی خریداری پر یا بیٹی کی شادی پر بے دریغ صرف کرنا۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت وعید آئی ہے۔

دنیا ہی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ وجہ یہ ہے کہ جب وہ شخص اللہ سے محبت کرتا ہے تو اسے بطفیل محبت ۔ عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور عارف دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ یہ دار الغرور ہے کیونکہ بقول نص قرآنی ۔ دنیاوی زندگی سراسر " متاع الغرور " ہے یعنی دھوکے کی پونجی ہے۔

عالم اور عارف میں یہی تو فرق ہے کہ عالم اس دنیا کے ظاہر سے واقف ہوتا ہے لیکن عارف اس کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے یعنی وہ دنیا کی حقیقت کو پہچان جاتا ہے۔ چوتھا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ سالک میں توکل اور استغنا کی وہ شان پیدا ہو جاتی ہے جس کی بدولت شاہان عالم اس کے آستانے پر حاضری کو اپنے لئے باعث افتخار بلکہ باعث حصول سعادت یقین کرتے ہیں۔ تاریخ ہند کے مطالعے سے یہ صداقت واضح ہو سکتی ہے کہ التمش ، غیاث الدین بلبن ، فیروز تغلق ، اکبر ، جہانگیر اور شاہجہان نے عاشقان الٰہی کے آستانوں پر حاضری دی ہے۔ ناظرین کو تاریخ کی اوراق گردانی سے بچانے کے لئے ان عاشقان الٰہی کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

(ا) التمش ۔ سیدی حضرت اقدس قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کا غلام تھا۔

(ب) بلبن ۔ شیخ شیوخ عالم شاہباز لامکان خواجہ فرید الدین گنج شکر اجودھنی رح کا غلام تھا۔

(ج) فیروز تغلق ۔ حضرت اقدس خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا غلام تھا۔

(د) اکبر ۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رح کا مرید تھا۔

(ہ) شاہجہان ۔ حضرت اقدس شیخ میاں میر رح اور حضرت شیخ فضل اللہ برہانپوری رح کا معتقد تھا۔

(ز) سلطان احمد خان بہمنی ۔ حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کا غلام تھا۔

(ط) جہانگیر ۔ حضرت میاں میر رح کا معتقد تھا۔

(ی) فاتح جونا گڑھ و چانپانیر سلطان محمود الملقب بہ بیگڑھا (دو قلعوں والا) حضرت اقدس سید شاہ عالم ابن سید برہان الدین قطب عالم نبیرہ مخدوم جہانیاں رح کا غلام تھا۔

(ک) بانی سلطنت گجرات سلطان احمد خان اول ۔ حضرت اقدس شیخ احمد کھٹو کا غلام تھا۔

ان سب بادشاہوں کا یہ عالم تھا کہ ان فقیروں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ اور ان کی کفش برداری کو اپنی عزت خیال کرتے تھے۔ جبھی تو اقبال نے یہ لافانی شعر لکھا ہے :۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ یہ شان استغنا صرف مسلک تصوف اختیار کرنے

سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پانچواں اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ سالک (عاشق) اپنے رزق کی طرف سے ۔۔۔۔ ۱۵-۰۰
کی طرف سے جس کے حصول کے لئے انسان ضمیر اور ایمان تک بیچ دیتا ہے ۔۔۔۔ بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے اس آیت کی صداقت پر کامل یقین ہوتا ہے :۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ (۶۵ - ۲ و ۳)

اور جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لئے مصیبت سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا۔ (اس کی پریشانی دور کر دے گا) اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ پہنچ سکے اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو وہ (اللہ) اسے کافی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ صوفی کسی دولت مند کے دروازے پر نہیں جاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رازق اللہ ہے نہ کہ انسان۔

اکبر الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :۔

دل میں تو ضعف عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

اور اقبال نے اس صداقت کو یوں نظم کیا ہے :۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

کشف المحجوب میں حضرت اقدس شیخ ہجویری رح نے لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے کسی فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ ، میں تیری خواہش بخوشی پوری کروں گا۔ فقیر نے زیر لب تبسم کیا اور کہا " میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟ " بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا " یہ کیا کہا؟ " فقیر نے جواب دیا :۔

" اے بادشاہ سن ! تو حرص اور امید دونوں کا غلام ہے اور یہ دونوں میرے غلام ہیں۔ اس لئے تو میرے غلاموں کا غلام ہے "

" انسانی کردار کے نشوونما اور تشکیل پر اس احساس کا بڑا عمیق اثر مرتب ہوتا ہے کہ وہ اپنی روزی کے لئے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے۔ تعمیر خودی اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اپنی روزی رساں نہ مان لے "[1]

[1] تاریخ مشائخ چشت رح مولفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب ص ۴۴ و ۴۵

(ب) مکارمِ اخلاق

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے " بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ " میری بعثت کی غایت یہ ہے کہ میں بہترین اور خوب ترین اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

اس لئے صوفیائے کرام نے سلوک کو تمام تر مکارمِ اخلاق کی تحصیل پر موقوف کیا ہے۔ بلکہ بعض مشائخ نے تو تصوف سے اخلاقِ حسنہ ہی مراد لیا ہے۔

"مشائخ کے نزدیک تصوف کا مطلب یہ ہے کہ پہلے انسان خود اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کرے۔ پھر بنی آدم کے اندر ان کی تخم ریزی کرے۔ چنانچہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں :-

"بہت نماز پڑھنا، وظائف میں بکثرت مشغول رہنا، تلاوتِ قرآن میں بہت مصروف رہنا۔ یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں، ہر باہمت شخص کر سکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے۔ وہ روزوں پر مداومت کر سکتی ہے، تہجد ادا کر سکتی ہے۔ قرآن مجید کے چند پارے بھی پڑھ سکتی ہے۔ لیکن مردانِ خدا کا کام کچھ اور ہی ہے " (سیر الاولیاء)

خلاصہ کلام اینکہ تمام مشائخ متقدمین کے نزدیک تصوف ایک مکمل ضابطۂ اخلاق کا نام ہے چنانچہ کشف المحجوب میں شیخ ابوالحسنؒ کا یہ قول مرقوم ہے " لیس التصوف رسومًا ولا علومًا ولکنہ اخلاق " یعنی تصوف نہ چند رسوم مذہبی ادا کرنے کا نام ہے اور نہ بعض علوم حاصل کرنے کا۔ بلکہ یہ تو سراسر اخلاقِ حسنہ کے مجموعے کا نام ہے۔

چونکہ اسی موضوع پر آئندہ اوراق میں اکابر صوفیا کے اقوال درج کئے جائیں گے اس لئے سردست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(ج) خدمتِ خلق

اس موضوع پر سب سے پہلے شیخ سعدیؒ کا مشہور شعر درج کرتا ہوں :-

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خدمتِ خلق کی جس قدر صورتیں ممکن ہیں صوفیائے کرام نے ان سب پر عمل کر کے دکھا دیا ہے۔ ان کی زندگیاں خدمتِ خلق کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔ انہوں نے لاکھوں انسانوں کو شیطان کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کیا یعنی ان کی زندگی کو با مقصد بنا دیا۔ واضح ہو کہ در اصل کارِ نبوت یہی ہے۔ انبیاء نے ساری عمر یہی کیا اور ساری عمر یہی کہا کہ " اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت " یعنی اے اللہ کے بندو! اللہ کی اطاعت کرو اور شیطان سے اجتناب کرو۔

صوفیائے کرام نے صحیح معنوں میں اتباعِ رسولؐ کا نمونہ پیش کیا اور اللہ کے بندوں کو شیطان کی غلامی سے نکال کر اللہ سے ملایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ کام نہ علماء سے ہو سکا نہ متکلمین سے نہ معتزلہ سے نہ حکماء سے نہ فقہا سے۔ یہ کام اگر ہو سکا تو ان نفوسِ قدسی سے جن کو صوفیائے اسلام کہا جاتا ہے اور جن کا نام آج بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے لہ

صوفیائے کرام کے ملفوظات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ خدمتِ خلق کو ان بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین ذریعہ بنا لیا تھا۔ سیر الاولیاء میں مرقوم ہے کہ :-

"سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی جس میں لکھا ہوا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچا۔ کیونکہ مومن کا دل اسرارِ الٰہی کا محل ہے۔ نیز فرمایا کہ قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اس قدر قیمتی نہ ہو گا جس قدر دلوں کو راحت پہنچانا"

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرامؒ بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر شخص کی دلداری کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہر وقت دوسروں کے غم میں گھلتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے ایک عزیز حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا کہ میں ایک دعوت میں گیا تھا وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ شیخ نظام الدین کو بڑم فراغِ باطنی حاصل ہے۔ انہیں اس جہان کا کوئی غم نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا

"جس قدر غم و اندوہ مجھے دامنگیر رہتا ہے شاید کسی کو نہ ہو کیونکہ بہت سے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور اپنا درد و غم مجھ سے بیان کرتے ہیں ان کے رنج و غم کا بوجھ میرے دل پر پڑتا ہے"

حضرت محبوب الٰہی رحؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرے۔ ایک دن فرمایا :-

"اگر کوئی شخص تیری راہ میں کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے جواب میں اس کی راہ میں کانٹا رکھ دے تو ساری دنیا کانٹوں سے معمور ہو جائے گی۔ عموماً لوگ ایسا ہی کرتے ہیں لیکن درویشوں کا یہ دستور نہیں ہے۔ انہیں نیک اور بد دونوں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے"

پھر فرمایا " بڑا کہنا بے شک بڑا ہے مگر بڑا چاہنا اس سے بھی زیادہ بڑا ہے " (فوائد الفواد)

حضرت محبوب الٰہی کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن گرمی کے موسم میں حاضرین کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ سائے میں جگہ نہ رہی۔ لوگ دھوپ میں بیٹھنے لگے تو فرمایا " آگے سرک آؤ۔ پاس پاس مل کر بیٹھو۔ تاکہ وہ

لہ مغربی تعلیم نے مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے کہ وہ بیزار اور غیر مطمئن سے تو واقف ہیں مگر صوفیائے کرام کی عظمت اور دینی خدمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہیں ۱۲

لوگ بھی سائے میں بیٹھ سکیں جو دھوپ میں بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دھوپ میں بیٹھے تو وہ ہیں اور جلتا میں ہوں" (فوائد الفواد)

ایک دن حضرت محبوب الٰہی کے خادم نے عرض کی کہ اگر آپ سحری کے وقت بھی کچھ نہیں کھائیں گے تو ضعف بہت بڑھ جائے گا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا "بہت سے درویش مسجدوں میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں، اس صورت میں کھانا میرے حلق سے کس طرح نیچے اتر سکتا ہے"

خدمت خلق کی مزید مثالیں آئندہ بھی درج کی جائیں گی اس لئے اب اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔

صوفیائے کرام کے کارنامے

آئندہ اوراق میں صوفیائے کرام کے کارناموں کی تفصیل درج کی جائے گی اس لئے اس جگہ اختصار سے کام لے کر چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں:-

(۱) اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں صوفیہ نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کرکے دنیا کو دکھایا۔

(۲) صوفیہ نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔

(۳) صوفیہ سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔

(۴) صوفیہ نے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمۂ حق کہا۔

(۵) جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہوا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا تو صوفیوں نے محبت الٰہی کا درس دے کر عقلیت کے مضر نتائج کا ازالہ کیا۔

(۶) جب فقہا نے دین کے ظواہر پر زور دیا تو صوفیہ نے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھائی۔

(۷) صوفیہ نے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد، شرک اور بدعت کی تردید کی۔

(۸) سرمایہ داری کے مقابلے میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی۔

(۹) بادشاہوں کو دین داری کی تلقین کی۔

(۱۰) جب معتزلہ فقہا اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں منقسم کر رہے تھے۔ اس وقت صوفیوں نے مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔

(۱۱) جب فقہا مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے۔ اس نازک دور میں صوفیوں نے ان کو محبت اور ہمدردی کا درس دیا۔

(۱۲) فقہا اور متکلمین نے مسلمانوں کو کافر بنایا۔ مگر صوفیائے کرام نے اپنی پاکیزہ زندگی کے ذریعے کافروں کو مسلمان بنایا۔

(۱۳) فقہا اور متکلمین اور معتزلہ نے مختلف مذہبی گروہ بنا کر مسلمانوں کے شیرازہ ملی کو منتشر کر دیا۔ مگر صوفیہ نے سب مسلمانوں کو جام وحدت پلایا۔

(۱۴) علماء اور فقہا بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے۔ مگر صوفیہ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر ملوکیت کے مفاسد بیان کرتے رہے۔

(۱۵) جب علما بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے تاویلات میں مشغول تھے اس وقت صوفیہ بادشاہوں کو خوفِ خدا کا درس دیتے رہے۔

(۱۶) معتزلہ، متکلمین اور حکماء نے اپنا وقت ذات و صفات باری کی بحثوں میں ضائع کیا۔ صوفیہ نے کہا کہ خدا کے باب میں بحث فضول ہے۔ خدا منطق کے ذریعے سے نہیں مل سکتا۔ آئینۂ قلب کو صاف کرو، تاکہ اس کا دیدار ہو سکے۔

(۱۷) علما نے دینی کتابیں لکھیں۔ صوفیہ نے وہ آدمی تیار کئے جنہوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کرکے انقلاب برپا کر دیا۔

(۱۸) علما (متکلمین، معتزلہ، حکماء) نے صرف دماغ کی آبیاری کی۔ صوفیہ نے دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام میں اصل چیز دل ہے نہ کہ دماغ۔ اگر دل فاسد ہو جائے تو دماغ کا فاسد ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "آگاہ ہو جاؤ انسان کے جسم میں ایک عضو ہے۔ اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم (انسانی) فاسد ہو جائے گا۔ اور اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے گا اور وہ عضو قلب ہے"

(۱۹) علما نے مسلمانوں میں گروہ بندی پیدا کی۔ صوفیہ نے انسانوں کو "الخلق عیال اللہ" کا درس دیا۔

(۲۰) علماء نے دلیلوں سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا۔ صوفیہ نے مشاہدہ باطنی کے ذریعے اسلام کی صداقت واضح کی۔

لوگوں نے امام احمد ابن حنبل رح سے پوچھا کہ بشر حافی رح تو عالم دین نہیں ہیں۔ پھر آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں کتاب اللہ سے آگاہ ہوں مگر بشر حافی، اللہ سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کا مرتبہ میرے مرتبے سے بدرجہا زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

ہم سے طلب فرمائیں

احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

"معارف الحدیث"

معہ اُردو ترجمہ و تشریح (از قلم مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر "الفرقان"، لکھنؤ

احادیث نبوی کا محفوظ ذخیرہ امت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے قائم مقام ہے۔ ایک صاحب ایمان اس کے مطالعہ کے وقت تصور کے راستہ سے مجلس نبوی میں پہنچ جاتا ہے آپکے ارشادات سنتا ہے اور آپ کے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے۔

مولانا نعمانی نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کیلئے ہدایت کا خاص سامان ہے پھر ان کی ترتیب اور ترجمہ و تشریح میں زمانہ کی نفسیات اور آج کے فکری ماحول کو خاص طور سے سامنے رکھا اور عالمانہ یا مدرسانہ بحثوں کی بجائے مطمح نظر بس یہ رکھا کہ پڑھنے والے کا ذہن مطمئن اور دل متاثر ہو اور اس میں اتباع کا جذبہ اور کسی درجہ میں وہ ذوق عمل پیدا ہو جو صحابہ کرام میں آپ کے ارشادات سے پیدا ہوتا تھا۔

الحمد للہ اس سلسلہ کی چار جلدیں عمدہ سفید کاغذ اور بڑے کتابی سائز پر حسین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل: کتاب الایمان یعنی آخرت۔ قیامت۔ حشر۔ صراط۔ میزان۔ حساب۔ جنت دوزخ وغیرہ سے متعلق حدیثیں۔ ۲۸۸ صفحات، قیمت: ۵/۵۰ روپے

جلد دوم: کتاب الرقاق والاخلاق یعنی تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں۔ اس جلد کا خاص موضوع دین کا وہ شعبہ ہے جو سلوک اور تصوف کا موضوع ہے۔ ۳۴۰ صفحات۔ قیمت ۶/۲۵ روپے

جلد سوم: کتاب الطہارت والصلوٰۃ یعنی طہارت اور نماز کے ابواب کی حدیثیں۔ اس جلد کی جامعیت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ۴۹۲ صفحات۔ قیمت ۷/۵۰ روپے

جلد چہارم: کتاب الزکوٰۃ والصوم والحج یعنی زکوٰۃ، روزہ رمضان اور حج کے ابواب کی حدیثیں۔ ۱۹۶ صفحات۔ قیمت ۵/۵۰ روپے
ہر جلد کے شروع میں مقدمہ ہے جو بجائے خود علمی و عرفانی تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔

نوٹ: محصول ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔

دارالاشاعت الاسلامیہ۔ امرت روڈ کرشن نگر لاہور ۱۲

خطوط و نکات

(۱)

؎ "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری"!

مولانا عبدالماجد دریابادی کا مکتوب مولانا امین احسن اصلاحی کے نام۔

[نیچے حسب ذیل مکتوب میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس تبصرے کے بارے میں جو مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے ان کی تفسیر کی طبع دوم پر 'میثاق' کی گزشتہ اشاعت میں نکلا تھا جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ تو قرآن کے دو مفسروں کی آپس کی باتیں ہیں، جن کے بارے میں کسی اور کا کچھ کہنا خواہ مخواہ کا دخل در معقولات ہے، البتہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے مقالے پر اپنی تحسین کو "تحسین ناشناس" قرار دینا یقیناً کسرِ نفسی کی انتہا ہے۔ اور اس کے بارے میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نزدیک تو یہ تحسین ؎ "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری" کی کامل مصداق ہے! ۔ مدیر]

" دریاباد بارہ بنکی

مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء

عزیز القدر وعلیکم السلام

تازہ 'میثاق' میں تفسیر کا تبصرہ پڑھ کر بڑی محجوبی رہی۔ اور ختم تک تو پڑھ بھی نہ سکا۔ صرف بڑا حصہ پڑھ لیا تھا۔ اور وہی بہت زیادہ تھا۔ کیا شان ستاری ہے۔ کیسے کیسے بے علموں اور کم علموں کو عالم و فاضل مشہور کر دیا ہے؟ اور اہل نظر تک کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

یہ کارڈ ایک دوسری غرض سے ہے۔ آپ کے قلم سے قرآنیات پر جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ماشاء اللہ خوب ہوتا ہی ہے۔ باقی یوسف سلیم چشتی صاحب کا جو مفصل مقالہ نکلا ہے وہ بھی بہت قابلِ داد ہے۔ علاوہ وسعتِ مطالعہ کے ان کی جرأت بھی بڑی قابلِ داد ہے۔ جزاک اللہ و ماشاء اللہ۔ ان کے بعض الفاظ میرے مذاق سے بہت الگ ہیں ..... باقی نفسِ مطالب سے پورا اتفاق ہے۔ یہ تحسین ناشناس صاحبِ مضمون تک ضرور پہنچا دیں۔

دعاگو و دعاخواہ عبدالماجد"

—————— (۲) ——————

مسلمانانِ ہند و پاک: قرب و بعد

[مولوی عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے اپنے درج ذیل مکتوب میں مولانا امین احسن اصلاحی کو ایک دیرینہ رفیق کے انتقال کی خبر جس انداز سے سنائی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو قریب ترین ہمسایہ ملکوں کے مسلمانوں کے مابین کتنی دوری اور کیسا مستقل بُعد پیدا ہو گیا ہے اور کتنے مرنے والے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی حسرتِ دید لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور ہیں: مدیر]

"دائرہ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح

سرائے میر۔ اعظم گڑھ

استاذِ مکرم۔ السلام علیکم۔

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔

یہ سن کر آپ کو انتہائی رنج ہوگا کہ ۱۴/۸/۶۸ء کو ۳ بجے دن میں، مشن ہاسپٹل اعظم گڑھ کے اندر محض چند دن کی علالت کے بعد، آپ کے رفیقِ دیرینہ جناب مولوی عبدالرزاق صاحب اصلاحی کا انتقال ہو گیا۔ — اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مرحوم کی عام صحت بالکل اچھی تھی۔ اچانک پیشاب رک گیا۔ بغرضِ علاج ہسپتال لے جائے گئے۔ آپریشن ہوا جو بظاہر بہت کامیاب رہا۔ لیکن پھر ضعف اتنا بڑھا کہ جانبر نہ ہو سکے۔ انتقال سے دو روز قبل جب میں ملنے گیا تو سراپا حسرت بنے لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کو اکثر یاد کیا کرتے تھے، شوقِ دید کے ساتھ! — معلوم نہیں آپ کب تک آئیں گے؟ اور جب آئیں گے بھی تو معلوم

نہیں اس وقت تک کتنی ہستیاں زیرِ زمین دفن ہو چکی ہوں گی!

نیاز کیش۔ عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی بی اے، ۲۲/۸/۶۸"

—————— (۳) ——————

'تدبرِ قرآن'۔ قرآن کے ایک طالبِ علم کی نگاہ میں

"پیپل گاؤں راجہ ضلع بلڈانہ

مہاراشٹر اسٹیٹ (انڈیا) ۱۹ر اگست ۱۹۶۸ء

مخدوم و مکرم حضرت مولانا اصلاحی صاحب اطال اللہ بقاؤکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج مبارک؟ ——— مولانائے محترم! میں قصبہ سنبھل ضلع مرادآباد یوپی کا باشندہ ہوں۔ بسلسلہ ملازمت مدرسی مہاراشٹر برار میں مقیم ہوں۔ ندوہ میں تعلیم حاصل کی، شروع سے اللہ کے فضل سے قرآن شریف کے مطالعہ کا شوق تھا۔ طالب علمی ہی میں آپ کے استاد محترم جناب مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کے ترجمہ کئے ہوئے تفسیری رسالے میسر آ گئے تھے اُن کو ۹۵ فیصد بے سمجھے پڑھتا رہتا تھا۔ مولانا منظور نعمانی صاحب نے جب میرا رجحان ادھر دیکھا تو آپ کے پرچہ 'الاصلاح' کی تین چار سال کی مکمل فائل مجھ کو عنایت فرما دی۔ پھر آپ کا پرچہ 'میثاق' نکلنا شروع ہوا جس کا میں خریدار اس مجبوری سے نہ بن سکا کہ بقول کسی 'خریداران' وہ کبھی وقت پر اور پابندی سے نہیں آتا تاہم میں مانگ مانگ کر پڑھتا رہا لیکن سلسلہ وار نہ مل سکا۔ اب آپ کی تفسیر "تدبر قرآن" کی پہلی جلد چھپ کر آئی تو میں نے 'الفرقان' کو آرڈر دیا جو آرڈر کے ٹھیک چار ماہ بعد پرسوں مجھ کو حاصل ہوئی ہے۔ اللہ کی حکمت و مشیت ایسی ہی تھی ورنہ وہاں سے تو وہ فوراً روانہ ہوئی تھی۔ میں آپ کی تفسیر کو اردو میں پہلی تفسیر خیال کرتا ہوں یہ بھی احساس رکھتا ہوں کہ قرآن پہلی دفعہ اردو میں آیا ہے۔ مولانا منظور صاحب نعمانی کے سامنے بھی اتفاق سے یہ الفاظ نکلے تو مولانا نے فرمایا کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی تفسیر نہیں ہے۔ اب خصوصی طور پر بصد ادب و احترام یہ عرض کرنا ہے کہ پہلی جلد کے پیشِ نظر پوری تفسیر کی تکمیل کے لیے کافی طویل عرصہ درکار ہے جناب کی عمر و صحت بھی سامنے ہے۔ آپ کی تفسیر اللہ کا ایک عطیہ ہے اور آپ پر اللہ کا خصوصی انعام ہے اگر خدانخواستہ تکمیل کو نہ پہنچی تو مولانا فراہیؒ کے بعد دوسرا صدمہ اہلِ علم کو پہنچے گا اگر جناب

دنیا و مافیہا سے کٹ کر اسی میں لگ جائیں تو بہت اچھا ہو۔ آپ خود بھی اس عزم کا اظہار میثاق میں فرما چکے ہیں اور آپ کے پاس اس طرح کی معروضات کے خطوط بھی آتے رہتے ہوں گے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ دوسرے مشاغل میں بھی بہت وقت صرف فرما رہے ہیں وہ مشاغل بھی مبارک و محترم ہیں لیکن یہ تو آپ کی زندگی کا اہم ترین فرض ہے اور ظاہری حالات میں آئندہ کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آ رہا ہے جو آپ کے اس سلسلے کی تکمیل کر سکے۔ جناب کی صحت و عافیت کے لیے دعاگو ہوں اور جناب کی دعوات صالحہ کا طالب۔

فقط والسلام مع کل الاحترام خادم محمد عارف"

— ۴ —

برید فرنگ

[برادر عزیز ابصار احمد سلمہٗ سے قارئین 'میثاق' واقف ہی ہیں۔ ان کے حالیہ دو خطوط میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کی مابہ النزاع تصنیف "اسلام" کے بارے میں ان کے کچھ تاثرات درج ہیں۔ جو بلا کسی تردید یا توثیق کے من و عن قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہیں ———— اسرار احمد]

"ریڈنگ: ۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء

برادرم مکرم - السلام علیکم و رحمۃ اللہ

" پرسوں آپ کا خط (ایک عرصے بعد) موصول ہوا۔ جملہ حالات معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ آجکل اپنے مطالعے میں زیادہ مصروفیت ہے۔ اس لیے ڈاکٹر فضل الرحمن کی تصنیف "اسلام" کے بارے میں زیادہ تفصیل سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہاں کے ایک پرچے "دی مسلم" 'THE MUSLIM' کے اپریل کے شمارے میں محترمہ مریم جمیلہ کا اس پر ایک مختصر تنقیدی مضمون شائع ہوا ہے۔ میں وہ کتاب تو تاحال حاصل نہیں کر سکا۔ صرف اسی مضمون سے اختلافی امور سے واقفیت ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے وحی، قرآنی قصص کی تاریخیت، فلسفہ شریعت، فقہی مسائل، نظام تعلیم (قدیم و جدید) اور جملہ مذہبی موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا چھٹا لیکچر "The Priciple of movement in The structure of Islam" میں نے یہاں کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ اجتہاد اور فقہی مسائل میں

ڈاکٹر فضل الرحمن کے خیالات اور حضرت علامہ کے اس لیکچر میں بڑی حد تک یگانگت ہے۔

یہ کتاب ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں عقلیت پسندی اور ORTHODOXY کے باہمی تنازعے کی ہی ایک کڑی ہے۔ علماء اور دین پسند حلقوں کا اس پر احتجاج اپنی جگہ بجا ہے۔

میرے تحقیقی کام کے خطوط اب جا کر متعین ہو گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میرا تحقیقی مضمون "The Bearing of Riligious Affirmation on morality" ہے۔ چنانچہ میرا اصل کام وجودی اخلاقیات پر ہو گا۔ اس ضمن میں مجھے خاصا کام کرنا ہے۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

گزشتہ چند روز سے مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ چنانچہ خنکی بڑھ گئی ہے۔ ویسے بھی اب سردیاں آیا چاہتی ہیں۔ یہاں سردیوں میں سردی اتنی تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اصل پریشانی دن کے بہت چھوٹا ہونے اور ہر وقت اندھیرا چھائے رہنے سے ہوتی ہے۔ دعاجو: ابصار احمد عفی عنہ

"ریڈنگ: ۱۹ ستمبر

چند روز قبل ایک مکتوب ارسال کیا تھا۔ مل گیا ہو گا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس کتاب کے بارے میں اطلاع دی ہوئی اور جس پر اپریل کے 'دی مسلم' کے شمارے میں مذکورہ مضمون بھی پڑھا۔ وہ خود میرے Book Shelf پر قریباً دس ماہ سے پڑی رہی۔ ہوا یوں کہ بالکل شروع میں اپنے دوست حسن ظفر عارف صاحب سے یہ کتاب لایا تھا جو فی الحقیقت "اسلام" مصنفہ فضل الرحمن صاحب کی غیر تصحیح شدہ پروف کاپی ہے۔ بہرحال پرسوں معلوم ہوا کہ یہ وہی کتاب ہے۔ چنانچہ اب کچھ مضامین دیکھ رہا ہوں۔ مسائل تمام ہی علمی ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے خالصۃً علمی و فلسفیانہ زبان استعمال کی ہے۔ میرے خیال میں وحی، قرآن، فقہ اور دوسرے تمام مباحث میں اختلافی امور کا اصل منبع ڈاکٹر صاحب کا حدیث کی AUTHENTICITY کو چیلنج کرنا ہے۔ اگرچہ سنتِ رسول اللہ (PROPHETIC EXAMPLE) ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی کوشش (میرے خیال میں) اپنی جگہ قابل ستائش ہے اور بالخصوص کتاب کے آخری ابواب میں انکا اسلام سے دردمندانہ تعلق بھی عیاں ہے۔ ———— کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر ایم ایم احمد صاحب کے انتقال کی خبر آپکو معلوم ہو گئی ہو گی پچھلے ماہ ہی وہ انگلستان آئے تھے۔ لندن میں ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ واپسی پر عمرے کے بعد جدہ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائیں۔

والسلام۔ دعاجو ابصار احمد"

(۵)

بلا تبصرہ و بلا عنوان

[چند ہفتے قبل اتوار کے روز سمن آباد کے حلقۂ مطالعہ قرآن کے اجتماع میں ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ ایک صاحب تھے جن سے اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے کی سرسری سی واقفیت تھی۔ دعا کے بعد علیک سلیک ہوئی اور انہوں نے راقم کے مکان پر تشریف لانے کا خیال ظاہر فرمایا۔ غالباً اسی شام کو وہ تشریف لائے اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد نہایت معصومانہ انداز میں دریافت فرمانے لگے کہ تمہارے جماعت سے علیحدہ ہونیکا کیا سبب ہوا؟ راقم نے عرض کیا کہ یہ ایک پرانی اور لمبی داستان ہے اسے چھوڑیئے اور حال کی بات کیجئے۔ لیکن وہ مصر ہوئے اور بار بار فرماتے رہے کہ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں اور ضرور کچھ نہ کچھ تو بتاؤ۔ تنگ آکر راقم نے ان کی خدمت میں اپنی تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی" پیش کر دی کہ آپ اسے دیکھ لیں۔ چند روز کے بعد ایک صاحب کی وساطت سے وہ کتاب ایک شاہانہ تبصرے کے ساتھ واپس موصول ہوئی۔ جو قارئین 'میثاق' کے تفننِ طبع کے لیے درج ذیل ہے۔ چونکہ راقم کو نہ ان کا نام یاد ہے۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنا پتہ تحریر فرمایا ہے لہٰذا ان کی اس 'کرمفرمائی' کا شکریہ بھی بذریعہ 'میثاق' ہی حاضر ہے۔ بقول "گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!" یہ واضح رہے کہ اس تحریر کے لکھنے والے ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں یعنی ایم اے! —— اسرار احمد]

مکرمی ڈاکٹر صاحب! میں نے آپکی کتاب کا بالتفصیل مطالعہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپکے تمام طرزِ استدلال میں نہ کوئی وزن ہے اور نہ کوئی اپیل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود کوئی فرشتے ہیں اور جماعت اسلامی والوں کو بھی فرشتہ ہی سمجھتے ہوں گے لیکن مولانا مودودی تو بہرحال ایک مسلمان عالمِ دین ہے اور ان سے غلطیوں کا ہو جانا عین ممکن ہے۔ ور کئی جگہ فی الواقع انہوں نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن وہ غلطی ایک نظریہ سے غلطی ہے اور دوسرے نقطہ نظر سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اب آپکی دینداری اور علم کا یہ حال ہے کہ آپ خود ان لوگوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یا مصلحت سے کام لیتے ہیں جنکی اسلام فروشی اور اسلام دشمنی اظہر من الشمس ہے لیکن آپ مودودی دشمنی میں خوب بیباک ہیں ——، زیادہ لکھنے سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں خود حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث حاضر نہیں ہو سکا۔ جو لوگ جمال ناصر کی تعریف کرتے ہیں اور آپ انکی اطاعت پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ آخر قیامت کے روز خدا کے ہاں کیا جواب دوگے۔ کیا جمال عبدالناصر کی اسلام دشمنی اور فرعونیت کوئی ڈھکی چھپی بات ہے۔ پھر بھی آپ سے ملاقات کرنیکی کوشش کرونگا ہم دیکھیں گے کہ آپ اب دین کی کیا خدمت کرتے ہیں۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ (بقیہ صفحہ ۸۰ پر)

مشکور حسین یاد
لیکچرر گورنمنٹ کالج لاہور

آخر کار

گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا جو مقالہ 'سائنس کی بے خدائیت کے خلاف اقبالؒ کا جہاد' کے موضوع پر شائع ہوا، ہمارے بھائی مشکور صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار کا مرکزی مضمون بھی چونکہ وہی ہے جو اس مقالے کا تھا، لہٰذا انہیں اس کے متصلاً بعد ہی شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

فروغ پائے گا آخر شعورِ انسانی
طلوع ہوگی یونہی خوابِ زندگی کی سحر

سنورتی جائیں گی زلفیں اسی قدر غم کی
نکھرتا جائے گا جتنا جمالِ علم و ہنر

تمام عقدوں پہ ہوں گے جو ناخنوں کے نشاں
بڑھے گا اور بھی اس طرح اعتبارِ نظر

"ISLAMIC EDUCATION"

The monthly journal which explains

★ **WHAT** Modern Islamic Education means and
★ **HOW** it alone can :

★ **BRING ABOUT** our perfect unity and integration

★ **ENABLE US** to recapture our former position of leadership in the field of science and

★ **BEFIT US** to play our destined role in the world as harbingers of world-peace & world-unity.

THE FIRST JOURNAL OF ITS KIND IN THE MUSLIM WORLD ISSUES UNDER THE EDITORSHIP OF
DR. MOHAMMAD RAFI-UD-DIN
PH.D., D.LITT

★

PLACE YOUR ORDER WITH

Annual Subscription
(Six Issues) Rs. 12/-
Per Copy Rs. 2/-

The Manager
"Islamic Education"
4 - Tariq Street, Poonch Road,
Lahore.

خرد قبول نہیں کرتی جن حقائق کو!
انہی کی درگہِ عالی میں کل جھکائے گی سر

حریمِ دہر کے پردے ذرا اٹھیں تو سہی
طلوع ہوتے ہیں پھر دیکھ کتنے شمس و قمر

پیامِ زیست ہے معراجِ حکمت و سائنس
بڑھے گا اتنا ہی ایماں ملے گی جتنی خبر

یہ کائنات ہے مظہر کسی کے جلووں کا
پکار اٹھیں گے خود خاک و باد و آب و شرر!

دل و نگاہ کا آخر یہ فیصلہ ہو گا
یقینِ ہستیٔ مطلق میں ہے نجاتِ بشر

بقیہ : خطوط و نکات

جو لوگ جماعت سے نکلے ہیں، اب تک تو انہوں نے کوئی کام متحدہ طریقے سے کیا نہیں ہے۔ اور آئندہ متحد ہونا بھی ناممکن ہے، اگر یہ لوگ اپنے طرزِ استدلال میں صحیح ہوتے اور انکو اپنے صحیح ہونے کا یقین ہوتا تو یقیناً یہ لوگ متحد ہو جاتے لیکن ان سے تو خارجی ہی اچھے جو اگرچہ گمراہ فرقہ تھا لیکن انکی صفوں میں اتحاد تو پایا جاتا تھا۔ لیکن آپ یقین رکھیں کہ جماعت اسلامی انشاء اللہ مسلسل اقامتِ دین کا کام کرتی رہے گی۔ اگر یہ جماعت گمراہ ہو گئی تو اللہ تعالےٰ کوئی اور جماعت لے آئے گا جو اقامتِ دین کا کام کرے گی۔ بہرحال یہ لوگ نہ متحد ہو سکتے ہیں اور نہ کوئی کام کر سکتے ہیں۔ چونکہ آپ ایک خاص طرز پر سوچتے ہیں جو صرف غلط ہے۔"